تیرے سنگِ در کی غلامی
ناول
بشریٰ رحمٰن

احمد عقیل روبی

بشریٰ رحمٰن کی ناول نگاری

مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک کہانی بہت پسند ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ موٹر گاڑی جب نئی نئی ہندوستان میں آئی تو صرف راجے مہاراجوں اور چند دولت مند، زمینداروں اور تاجروں کے حصے میں آئی۔ ان میں کلکتہ کا ایک ہندو چودھری بھی تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک کی عمر 10 سال تھی، ایک 12 سال کا تھا۔ دونوں کو موٹر کار میں بٹھا کر وہ شام کو سیر کے لئے نکل جاتا اور سارا شہر اس جادو کی گاڑی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا۔

ایک دن وہ گاڑی چلاتا چلاتا جنگل کی طرف نکل گیا۔ اچانک اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ شہر کے بڑے ہسپتال میں تھا۔ ڈاکٹر نے اسے کہا۔

"آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی جان بچ گئی۔ اگر آپ کا بیٹا آپ کو بروقت ہسپتال نہ لاتا تو آپ پرلوک سدھار گئے تھے۔"

چودھری نے حیران ہو کر اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"تم میں سے کون گاڑی چلا کر مجھے یہاں لایا تھا......؟"

چھوٹے بیٹے نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میں پتا جی......!''

''لیکن میں نے تو تمہیں گاڑی چلانا سکھایا ہی نہیں۔ یہ کام تم نے کیسے کرلیا......؟''

بیٹے نے جواب دیا۔

''آپ نے ہمیں کہا تھا کہ غور سے دیکھو، دھیان سے سنو، اور سمجھو اور پھر اپنا کام شروع کر دو۔ آپ گاڑی چلاتے وقت جو جو کرتے تھے۔ کل پرزوں کے بارے میں جو جو باتیں کرتے تھے، میں نے غور سے دیکھا اور سنا اور پھر گاڑی چلا کر آپ کو ہسپتال لے آیا۔''

بس ناول نویسی بھی میرے نزدیک چیزوں اور اپنے ماحول کو غور سے دیکھنے اور ماحول میں گونجتی آوازوں کو سننے، سمجھنے اور پھر انہیں سلیقے سے لکھنے کا ہنر ہے۔ لیکن تربیت کے لئے ایک باپ یا ایک ماں یا ایک راہنما کا ہونا ضروری ہے۔ جو زندگی کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہو اور آپ اسے گاڑی چلاتا دیکھ رہے ہوں اور سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی حس آپ میں موجود ہو۔

بشریٰ رحمٰن میں یہ تینوں صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ باپ اور ماں کی صورت میں اسے دو (God Fathers) بھی مل گئے اور پھر وہ ناول نگار کے روپ میں ڈھل گئیں۔

بہاولپور کا شمار کبھی برصغیر کی ان چند ریاستوں میں ہوتا تھا، جہاں

خوشحالی اپنے پر پھیلائے اپنے باسیوں کو تنگ دستی کی دھوپ سے بچانے میں پیش پیش تھی۔ سہولتیں بے شمار، تعلیم سب کے لئے ریاست کی ذمہ داری، دور دور سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے تھے اور علم کی پیاس بجھا کر چلے جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ دنیاداری سے لاعلم، رکھ رکھاؤ کے پیکر، زبان میٹھی، لہجہ شیریں، مہمان نواز، یہاں جو آتا، اسی کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ میں 1965ء میں جب رات کو 2 بجے گاڑی سے اُترا تو میرے بال بکھرے تھے۔ تھکن سے چور، پریشان، اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک میں تھا اور ایک بوڑھا ٹکٹ چیکر۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولا۔

''سائیں روندے آئے ہو......؟''

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا تو وہ پھر مسکرا کر بولا۔

''گھبراؤ نہ سائیں......! اے شہر بہت چنگا تے مہمان نواز اے۔ اَج روندے آئے او......! کل ایتھوں روندے ویسو......!''

اس وقت تو مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی لیکن 5 سال بعد جب ایس ای کالج سے میرا تبادلہ شیخوپورہ ہوا تو میں بہاولپور سے روتا ہوا آیا تھا۔

بہاولپور کے مرکزی دروازے فرید گیٹ سے اگر آپ ایس ای کالج کی طرف سے داخل ہوں اور بازار میں سیدھے چلتے رہیں اور چوک میں پہنچ کر پہلے دائیں طرف بازار میں داخل ہو جائیں تو مشہور و معروف شخصیت ابوالعرفان حکیم محمد عبدالرشید کا گھر آتا ہے جو علم و عرفان اور دانش کا مرکز تھا اور جہاں شہر کے نامور شاعر، ادیب اور دانش ور ہر شام اکٹھے ہوتے تھے۔

دستر خوان سجتا، علم و دانش کی محفلیں جمتی، اُردو، فارسی، عربی، سرائیکی زبان کی فاختائیں نغمہ زن ہوتیں۔ دین اور دُنیا پر گفتگو ہوتی۔ روح قلب اور عشق حقیقی کے سازینے چھڑتے۔ چلمن کے اس طرف مرد بیٹھتے۔ چلمن کی دوسری طرف خواتین بیٹھتیں۔ اور علم و دانش کی سب آوازوں پر کان دھرتیں۔ ان میں دو نوخیز کلیاں بھی تھیں۔ ایک فرحت رشید اور دوسری بشریٰ رشید۔ جب علم و دانش کے اس پالنے سے دونوں نے باہر قدم رکھا تو فرحت شجاع اور بشریٰ رحمٰن کے ناموں سے جانی پہچانی گئیں اور دونوں نے نام کمایا۔

میں اپنے اس مضمون میں فرحت شجاع اور حکیم عبدالرشید صاحب سے ہٹ کر بات کروں گا۔ کیونکہ ان دونوں کے بارے میں لکھنے کے لئے ایک اور مضمون کا ڈول ڈالنا پڑے گا۔ میں فی الحال اپنے مضمون کا رُخ بشریٰ رحمٰن ہی کی طرف کرتا ہوں۔

انگریزی زبان کی مشہور ناول نگر شارلٹ برانٹے اور بشریٰ رحمٰن میں چند مماثلتیں بہت نمایاں ہیں۔ دونوں کا آئیڈیل ان کا باپ تھا۔ دونوں نے گھر کی چار دیواری میں اپنی دُنیا آباد کی۔ دونوں نے گھر کی دیواروں میں چہرے تلاش کئے۔ دونوں نے چادر اور چار دیواری میں اپنے ناولوں کے لئے کردار ڈھونڈے اور پھر (Home University) سے باہر آ کر ناول نگار بن گئیں اور اپنی اپنی زبان میں ناول لکھے اور مقبولیت حاصل کی۔

بشریٰ رحمٰن کے ناولوں میں اگر آپ جھانک کر دیکھیں تو آپ کو کرداروں کا ایک قافلہ رواں دواں نظر آئے گا۔ یہ سب کردار وفا، بے وفائی، غرور، عاجزی، سچ، جھوٹ، منافقت، مصلحت، ہنر، بے ہنری، ہار، جیت،

شرارت، شوخی، محبت، نفرت، جذبات کی بارش میں بھیگی گفتگو، سرگوشیوں اور چوری چھپے بندھے رشتوں کی تختیاں اپنے اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ اور بشریٰ رحمٰن ان کے شب و روز میں رینگتے واقعات اپنے اسلوب کے دھاگوں میں پرو کر ناول لکھے جا رہی ہے اور عہد حاضر میں سرکاراما ہمارے سامنے چلتا رہتا ہے۔ انسانوں کی نفسیاتی گرہیں کھلتی رہتی ہیں اور کہانی میں (Twists) آتے رہتے ہیں۔ کہانی میں دلچسپی اور تجسس بڑھتا رہتا ہے اور ہم پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انگریزی نقاد، اور شاعر میتھیو آرنلڈ نے کہا تھا۔

"It is easy to write a book but it is difficult to write a readable book."

بشریٰ رحمٰن کو یہ مشکل کام آتا ہے۔ کہانی کہنے کے فن نے اس کی ہر کتاب کو Read able بنا دیا ہے۔

بشریٰ رحمٰن اپنے ناول کے ہر کردار میں رچی بسی ہے۔ خاص طور پر نسوانی کرداروں میں۔ نیّا، رملی، آمنہ، افسوں، توشہ ہو یا شبنم، زارا، زلیخا، للّی، آئینہ، لیلیٰ، پارسا ہو یا قوسیہ، ان سب میں کسی نہ کسی انداز میں بشریٰ رحمٰن موجود ہے۔ کسی میں اس کی چال ڈھال ہے، کسی میں لب و لہجہ، کسی میں اس کی وفا، کسی میں تھوڑی سی بے وفائی، کسی میں ناز، ادا، شوخی، شرارت اور کسی میں اس کے شب و روز کے دُکھ سکھ، کسی میں ممتا، کسی میں عاجزی اور فقیری، غرض ہر کردار میں آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے۔

بشریٰ رحمٰن میں ایک پختہ ناول نگار کے سب گن موجود ہیں۔ زبان،

واقعات کی بنت، کردار نگاری، مشاہدہ، تجربہ، کرداروں کے باطن میں جھانکنے کی صلاحیت، سوشل اور معاشرتی سیٹ اَپ میں بدلتی اقدار پر بھرپور نظر، ان سب خصوصیات نے اسے مقبول ناول نگار بنا دیا ہے اور اس نے ناول کی دُنیا میں اپنے حصے کی زمین پر قبضہ کرلیا ہے۔

بشریٰ رحمٰن نے انسانی رشتوں کے دھاگوں کو اکٹھا کر کے اپنے ناولوں کی چادریں تیار کی ہیں۔ ان چادروں پر ہمارے معاشرے کے دُکھ درد، اور رشتے ناطوں کے پھول اس طرح کاڑھے گئے ہیں کہ ہر چھوٹا بڑا ان کی طرف دوڑتا ہے۔ اسے ہند و پاک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

۱۔ چارہ گر ۲۔ پیاسی
۳۔ لگن ۴۔ لازوال
۵۔ خوب صورت ۶۔ کس موڑ پر ملے ہو؟
۷۔ پارسا ۸۔ دانا رسوئی

اور

۹۔ تیرے سنگ در کی تلاش تھی

اس کے وہ ناول ہیں جو بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

بقول شفیق الرحمٰن:

’’بشریٰ رحمٰن جیسی مقبولیت بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔‘‘

اور یہ اعزاز تو صرف بشریٰ رحمٰن کو نصیب ہوا ہے کہ اس کے ناول ’’لگن‘‘ کے بارے میں بے شمار افراد نے یہ رائے دی کہ یہ ناول ہر لڑکی کو

شادی سے پہلے پڑھنا چاہیے۔ چنانچہ پبلشر کو اس رائے کا احترام کرنا پڑا اور اس کا ایک جہیز ایڈیشن چھاپا گیا اور لوگوں نے یہ ناول اپنی بیٹیوں کے دیئے جانے والے جہیز کا حصہ بنا دیا۔

’’پارسا‘‘ ناول میں بشریٰ رحمٰن نے اپنا یہ مؤقف پیش کیا کہ محبت مذہب کا درجہ نہیں حاصل کرسکتی۔ دین دین ہے، اور محبت محبت ہے۔

’’خوب صورت‘‘ ناول نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے اس خیال اور جنون کی تردید کرتا ہے کہ اصل خوب صورتی جسمانی خوب صورتی نہیں ہوتی ہے۔ اس نے ناول میں یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کی اصل اور حقیقی خوب صورتی سیرت اور کردار میں چھپی ہے۔ ملٹن (Milton) نے کہا تھا۔

"Beauty represents the sight only
but quality wins the soul."

بس یہ ناول اسی نظریے کی واضح تفصیل ہے۔

’’کس موڑ پر ملے ہو؟‘‘ کا پلاٹ اُٹھا کر ہندوستانی فلم ساز نے ’’آپ ہمارے دل میں رہتے ہیں‘‘ نامی فلم بنا ڈالی۔ یہ کہانی ایک سائینٹفک تجربہ ہے جسے بشریٰ رحمٰن نے روحانی کہانی میں ڈھال دیا ہے۔ دل کی تبدیلی کا خوب صورت پلاٹ اس ناول کی جان ہے۔ اس کا ہر ناول ایک انسانی اور معاشرتی اُلجھن کا تحریری سلجھاؤ ہے۔

بشریٰ رحمٰن بہت زود نویس ہے۔ اس کا قلم ہر وقت کسی نہ کسی موضوع کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب موضوع ہاتھ آجائے تو چل پڑتا ہے اور ایک ناول بن جاتا ہے۔ بہت زیادہ لکھنا بری بات نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ

مصنف جو لکھتا ہے، وہ بے معنی ہو کر نہ رہ جائے۔

فرانس کے مشہور ناول نگار بالزاک (Balzac) نے بہت لکھا۔ اس نے ناول لکھنے سے پہلے ایک منصوبہ بندی کی تھی اور ہیومن کامیڈی (LA Comedit Hamane) کے زیرعنوان 100 ناول لکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں فرانس کے معاشرے کا جنرل سیکرٹری ہوں۔ انسانوں کی جانوروں کی طرح بے شمار اقسام ہیں۔ انسانوں کی بھی جتنی قسمیں ہیں، ان پر ناول لکھوں گا۔ چنانچہ اس نے بے شمار ناول لکھے جن سے اسے عالمی شہرت ملی۔ ایک نقاد نے وکٹر ہیوگور (Victor Hugo) سے پوچھا۔

''یہ بالزاک اتنے ناول کیوں لکھے جا رہا ہے......؟''

وکٹر ہیوگو نے ہنس کر کہا۔

''وہ ایک بڑے ناول کی تلاش میں ہے۔''

اور پھر بالزاک نے ایک بڑا ناول ''بوڑھا گوریو'' لکھ لیا جو دُنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔

بشریٰ رحمٰن کو بھی ایک بڑے اور اچھے ناول کی تلاش تھی۔ جس کی تلاش میں اس نے بے شمار ناول لکھے۔ جن سے اس نے نام کمایا اور اسے شہرت ملی اور پھر اس نے ایک بڑا ناول لکھ ہی لیا۔ جسے میں اس کا سب سے اچھا ناول کہتا ہوں اور میرے نزدیک وہ ناول یعنی ''تیرے سنگ در کی تلاش تھی'' اس کا بہترین ناول ہے۔ جسے میں A touch of class کہہ سکتا ہوں۔

آدمی میں ہمہ وقت تین طاقتیں برسرپیکار رہتی ہیں۔ یہ دل، عقل اور

روح کی طاقتیں کہلاتی ہیں۔ آدمی عام طور پر دل اور عقل کی طاقتوں کو میدان میں اُتارتا ہے۔ دولت، ہوس، دُنیاداری، مصلحت، عشق مجازی کی ٹوٹنکی میں بھیس بدل بدل کر اندر سجا سجاتا ہے۔ جب یہ دونوں طاقتیں کمزور پڑ جاتی ہیں، آدمی قدرت اور حالات کے سامنے نڈھال ہو کر شکست خوردہ جانور کی طرح ہانپنے لگتا ہے۔ اس لمحے اسے روحانی طاقت سہارا دیتی ہے۔ بدن میں پھر سے جان آ جاتی ہے۔ آنکھوں میں روشنی چمک اُٹھتی ہے۔ کمزوری طاقت میں بدل جاتی ہے اور شکست خوردہ آدمی، آدمی سے انسان بن کر روح کی گزرگاہ پر سفر شروع کر دیتا ہے۔ بشریٰ رحمٰن کا یہ ناول اس روحانی سفر کی کہانی ہے۔ یہ ناول ایک عورت کی (Spirtual Odysse) ہے۔ جو اس کے اس روحانی خواب کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اس نے برسوں پہلے دیکھا تھا اور خواب کی تعبیر 60 سال بعد ملتی ہے۔ جن لکھنے والوں کے ہاں روحانیت اور تصوف بچپن میں اپنے بیج بکھیر دیتے ہیں، ان کے ہاں فصلیں بہت دیر کے بعد اُگتی ہیں اور پھر خزاں کے موسم میں بہار کی رُت لہرانے لگتی ہے۔

بشریٰ رحمٰن اس روحانی تجربے سے گزری ہے۔ روحانیت کی چنگاریوں نے اسے جلا کر راکھ کیا ہے تو یہ ناول لکھا گیا ہے۔ پندرہ دنوں میں اتنا (Touching) ناول وہی آدمی لکھ سکتا ہے جب کوئی اندرونی طاقت اسے لکھوا رہی ہو۔ یہ شاید انسان کی وہ دوسری شخصیت (Second Self) ہوتی ہے جس کا دُنیاداری اور مادی اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بشریٰ رحمٰن کی آنکھوں میں پھیلی حیرانی سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ''دوسری

شخصیت'' ہر پل موجود رہتی ہے جسے وہ دُنیا سے چھپا کر رکھتی ہے۔ یہ ناول اس روحانی تجربے کا کیا دھرا ہے اور اسی ''دوسری شخصیت'' کی لکھت ہے۔

''تیرے سنگ در کی تلاش تھی'' ایک لڑکی تسبیحہ کی کہانی ہے جو اپنے باپ کی لاڈلی بیٹی اور دو بہنوں کی چہیتی ہے۔ باپ کی خواہش ہے کہ تسبیحہ شادی کر لے مگر وہ اپنی بہنوں کی شادی کو اوّلیت دیتی ہے۔ ذہین ہے، خوب صورت ہے، علم و دانش کے ہنر سے واقف ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے۔ باپ کی وفات کے بعد بہنوں کی شادیاں کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔ دونوں بہنوں کی شادی کرتی ہے اور خود ایک کانفرنس کے دوران لندن میں مدہوش نامی ایک چرب زبان کے جال میں پھنس جاتی ہے۔ جو محبت کا جال اتنے سلیقے سے بچھاتا ہے کہ جھوٹ پر سچ کا گمان ہوتا ہے۔ شادی کے بعد اس آدمی کا اصل چہرہ سامنے آتا ہے اور تسبیحہ ان تمام عذابوں سے گزرتی ہے جو دوزخ میں گنہگاروں کے لئے تیار کیے جاتے ہیں لیکن قسمت دُنیا میں تسبیحہ کی جھولی میں ڈال دیتی ہے۔ مدہوش کے کردہ گناہوں کی سزا تسبیحہ کو ملتی ہے۔ مدہوش آخر مر جاتا ہے اور تسبیحہ کو اولاد پالنے اور ڈھلتی عمر کے عذاب سہنے کی سزا سنا جاتا ہے۔

تسبیحہ ایمانداری اور محنت سے بچوں کو اچھا مستقبل سونپتی ہے اور گزرے دنوں کے دیئے ہوئے زخموں کو یاد کر کر کے آنسو بہاتی ہے اور پھر کہانی میں ایک (Twist) آتا ہے اور اسے ایک بین الاقوامی تعلیمی اوارے میں نوکری کی آفر ہوتی ہے۔ جس کے کرتا دھرتا عطار ہیں۔

عطار ہی تسبیحہ کے خواب کی دُھندلی سی تعبیر ہے اور تسبیحہ عطار کے

خواب کی واضح تعبیر......!

دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ تسبیحہ محسوس کرتی ہے جیسے اس کے اندر ایک تبدیلی آنا شروع ہوگئی ہے۔ جس سے وہ کچھ کچھ خوفزدہ ہے۔ یہ ڈر اور خواب کی تعبیر کا دُھندلا پن اس وقت دُور ہو جاتا ہے جب عطار کی دعوت پر امریکہ جاتی ہے۔

امریکہ میں جب تسبیحہ عطار کے گھر پہنچتی ہے تو وہ گھر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے۔

''یہی تو وہ گھر ہے جو میں ایک طویل عرصے سے اپنے خوابوں میں دیکھ رہی ہوں۔''

امریکہ میں تسبیحہ کی پہلی رات عطار اور تسبیحہ کی زندگی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ عطار اور تسبیحہ دونوں ایک ہی خواب بچپن سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے خواب کی تعبیر ہیں۔ 60 سال کی عمر میں عطار اور تسبیحہ اپنی اپنی تعبیر سامنے دیکھ کر ایک بار پھر برسوں پیچھے چلے جاتے ہیں۔ خزاں میں بہار اپنی آمد کا اعلان کر دیتی ہے۔

خاموشی بدلنے لگتی ہے۔ خواب جاگ اُٹھتے ہیں اور تسبیحہ عطار سے کہتی ہے۔ میں اپنے خواب کی تعبیر کو دوبارہ گم نہیں ہونے دوں گی۔ مناسب وقت دیکھ کر اپنے بچوں سے بات کروں گی کہ میں عطار صاحب سے شادی کر رہی ہوں۔

60 سال کی عمر میں شادی کرنے کا فیصلہ سن کر تسبیحہ کے بچوں کے چہروں پر غصے اور ناراضگی کی چنگاریاں پھوٹنے لگتی ہیں۔ تسبیحہ ان کی باتیں سن

کر محسوس کرتی ہے جیسے وہ ان لوگوں میں گھر گئی ہو جو اس کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔ اچانک تسبیحہ کے اندر ایک عجیب وغریب جذبہ سر اُٹھاتا ہے اور وہ گوتم بدھ کی طرح اپنا گھر چھوڑ کر کہیں چلی جاتی ہے۔ گوتم بدھ نروان اور مکتی حاصل کرنے جنگل میں چلا گیا تھا۔

تسبیحہ مسجد نبویؐ کا رُخ کرتی ہے اور وہاں جھاڑو دینے والوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ دُنیاوی رشتوں سے کنارہ کش ہو کر صرف ایک ذات سے رشتہ جوڑ لیتی ہے جو سب سے بڑی ذات ہے۔ اس کے بیٹے اس کی تلاش میں مصروف ہیں۔

عطار سے ملاقات ہوتی ہے۔ تسبیحہ کے بچوں کی آنکھوں میں غلط فہمیوں کی گرد دُور ہوتی ہے۔ عطار کا کردار سامنے آتا ہے تو سب کے اندر کی کدورت جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ تسبیحہ کے بیٹے درمان کو عطار مدینہ کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر مقرر کرا دیتے ہیں اور بیٹا دن رات مسجد نبویؐ آنے والی عورتوں میں اپنی ماں کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اور پھر ایک دن بہت ڈرامائی انداز میں درمان کی اپنی ماں تسبیحہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس ماں سے جو سب رشتوں کو بھلا چکی ہے۔ لیکن درمان کی بے چینی، معصومیت، بے کسی، اس کے اندر سوئی ممتا کو جگا دیتی ہے اور پھر ناول ایک ایسے (Note) پر ختم ہوتا ہے جو قاری کو چونکا دیتا ہے۔

اس ناول میں چونکا دینے والے بے شمار موڑ ہیں جہاں سے بشریٰ رحمٰن بہت ہنرمندی سے گزری ہے۔ بے ساختہ انداز میں لکھا ہوا یہ ناول اپنے (Content) اور کردار و واقعات کے حوالے سے ایک منفرد نوعیت کا ناول

ہے۔ ایک ایسا ناول جس میں ناول نگار کو خود سے کچھ نہیں کرنا پڑا، کہانی اپنے آپ کو خود لکھواتی چلی گئی ہے۔

میرا خیال ہے اس نوعیت کا ناول لکھنے والا ایک ایسی کیفیت میں ڈوب کر لکھتا ہے جو لکھنے والے کا ہر رشتہ اس مادی دُنیا سے توڑ دیتی ہے۔ بشریٰ رحمٰن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

''تیرے سنگ در کی تلاش تھی'' کی تمہید باندھتے ہوئے میں عقل، دل اور روح کی تین طاقتوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ ناول انہیں تین طاقتوں کی تکون میں گھرا ہوا ہے۔ پہلے حصے میں عقل اور دل کا کھیل رچایا جاتا ہے۔ تسبیحہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عقلِ عیار کے جال میں پھنستی ہے۔ اس سارے کھیل کے پس منظر میں روح کی کھیتی لہراتی رہتی ہے۔ جب عقل اور دل کی طاقتیں دم توڑ جاتی ہیں تو روح کی حکمرانی شروع ہوتی ہے۔ روح کی حکمرانی میں دل اور عقل کو پورا پورا انصاف ملتا ہے اور تینوں طاقتیں ایک ہو کر ایک ایسا مرکب تیار کرتی ہیں جس کا نام ''تیرے سنگ در کی تلاش تھی'' رکھا جاتا ہے۔

یہ ناول بشریٰ رحمٰن کو بہت پسند ہے۔ وہ اس کی بہت تعریف کرتی ہے۔ ایک ایک منظر کو معصوم بچوں کی طرح دُہراتی ہے۔ ''اپنے منہ میاں مٹھو'' کی یہ کہانی سن کر میں بالکل نہیں چونکا، بلکہ مجھے مشہور انگریزی شاعر ولیم بلیک (Willam Blake) کی ایک بات یاد آگئی۔ اس نے اپنی محبوبہ کو اپنی ایک نظم بھیجی اور اس نظم کی تعریف میں ایک تفصیلی خط بھی لکھ دیا۔ خط کے آخر میں صرف ایک جملہ بھی لکھ دیا۔

''تم حیران ہو کہ میں اپنی اس نظم کی خود ہی تعریف کیے
چلا جا رہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ نظم میں نے نہیں
لکھی۔ میں تو صرف منشی تھا لکھوانے والا کوئی اور تھا۔''

یہ ناول بھی بشریٰ نے نہیں لکھا۔ وہ تو صرف منشی کا کردار ادا کر رہی تھی۔ لکھوانے والا کوئی اور تھا۔ اس کا Second Self اس کے اندر بیٹھا کوئی تخلیق کار۔ جس کا اس دُنیا سے کوئی واسطہ نہیں میں اب اس تخلیق کار اور آپ کے درمیان سے ہٹ جاتا ہوں۔ آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے۔

تقدیر......؟

تیرے سنگِ در کی تلاش تھی؟

یہ تلاش ہے!

تجھے چاہنے کی جو پیاس تھی؟

وہی پیاس ہے!

تجھے دیکھنے کی جو آس تھی؟

وہی آس ہے!

❀❀❀

تسبیحہ ایک غیر ملکی ایئر لائن کے جہاز کی بزنس کلاس میں سیٹ نمبر 3 پر آکر بیٹھ گئی۔ اندر بزنس کلاس والی مدارات شروع ہوگئیں۔ پہلے ننھے ننھے گرم تولیے ایئر ہوسٹس ٹرے میں لگا کر لائی۔ پھر ایک چھوٹے سے چمٹے سے اُٹھا اُٹھا کر تقسیم کرنے لگی۔ جیسے کہ یہ اُونچے طبقے کے مسافر گھروں سے منہ ہاتھ دھوئے بغیر آگئے ہوں۔ عورتیں عام طور پر ان بچگانہ قسم کے تولیوں سے صرف ہاتھ صاف کر کے انہیں سائیڈ پر رکھ دیتی ہیں۔ جبکہ مرد حضرات باقاعدہ ان سے اپنا چہرہ اور گردن صاف کر لیتے ہیں۔ غالباً عورتوں کو اپنا میک اپ اُتر جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ مگر آج تسبیحہ نے نیم گرم تولیہ کھول کر اس کی تہہ بنائی اور اپنی دونوں آنکھوں پر رکھ لی۔ تولیے کی گرمائش نے اس کی سوجھی ہوئی بے خواب آنکھوں کے پھولے ہوئے پپوٹوں کو بڑی آسودگی بخشی۔ گرم گرم ٹکور...... جیسے ماں کے رسوئی میں رندھے ہوئے ہاتھ ہوں۔ بیلٹ اس نے بیٹھتے ہی باندھ لی تھی۔ پھر اس نے آرام دہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور اسی حالت میں آنکھیں موند کے سر بھی ٹکا لیا۔ ایئر ہوسٹس جوس کے گلاس لائی تھی۔ لیمن ڈراپس بھی لائی تھی۔ مگر اس کو ریلیکسنگ پوسچر میں دیکھ کر ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پائلٹ نے خوش آمدید کہہ کے ٹیک آف کے کاشن دئیے۔ اندر سفری ہدایات کی مشقیں شروع ہوگئیں۔ جہاز کے بلند ہوتے ہی تسنیمہ کے ذہن کی ساری کھڑکیاں بھی کھل گئیں۔ ایک سال کی سوچ بچار، ذہنی کشمکش اور مشکل ترین فیصلے سے گزرنے کے بعد اس نے اپنے دونوں بڑے بچوں کو پاکستان بلایا تھا۔ چھوٹا بیٹا جس کا اس نے درمان نام رکھا تھا، یہیں پاکستان میں اس کے پاس رہتا تھا۔

پہلے اس نے ساری صورت حال اپنی بڑی بیٹی تسمیہ کے سامنے رکھی تھی۔ تسمیہ صرف اس کی بیٹی ہی نہیں، اس کی سہیلی بھی تھی۔ دُکھ سکھ میں ہمیشہ سہارا بن جاتی۔ کڑے وقت میں فوراً آجاتی اور مشورے بھی اچھے دیتی تھی۔

اس روز جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہاں تابش اور درمان کے ساتھ تسمیہ بھی موجود تھی۔ گویا تسمیہ نے دونوں بھائیوں کو ساری بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس کے دل میں تسلی کی ایک لہر اُٹھی۔ وہ بڑے پرُاُمید چہرے کے ساتھ وہاں آکر بیٹھ گئی۔ تب تسمیہ نے اچانک بڑے طنز کے ساتھ کہا۔

''تابش اور درمان......! تمہیں مبارک ہو......! بڑھاپے میں تمہاری ماں کو عشق ہوگیا ہے۔''

یہ الفاظ تسنیمہ کی توقعات پر بم کی طرح پھٹے۔

اس نے باری باری تینوں بچوں کے چہرے دیکھے اور سناٹے میں آگئی۔

بالآخر تابش بولا۔

''ماما......! آپ کو کیا ہوگیا ہے......؟ اس عمر میں آپ شادی کرنا چاہتی ہیں......؟ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کی بقایا عمر کتنی ہے......؟ پانچ سال......؟ پانچ مہینے......؟ یا پانچ دن......

چند دنوں کی راحت کے لئے آپ اپنی ساری زندگی پر دھبہ لگانا چاہتی ہیں......؟''

تسنیمہ اندر سے لرز گئی۔

تسمیہ چہک کر بولی۔

''میری بڑی بیٹی پندرہ سال کی ہے۔ نانی کا فرض بنتا ہے کہ نواسی کے لئے اچھا رشتہ تلاش کرے ......نا کہ نواسی کو اپنی شادی میں شرکت کی دعوت دے۔ میں تو یہاں اس لئے دوڑی آئی کہ نہ جانے ماما کو کیا افتاد آپڑی ہے کہ یوں بلا بھیجا ہے مگر یہاں آکر اور آپ کی باتیں سن کر اپنے آپ پر غصہ آیا۔

ماما......! آخر آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ ہم بال بچوں والے ہیں۔ ہم اپنے بچوں سے کیا کہیں گے......؟ جن کو ہم نے پاکستانی بزرگوں کی عظمت کے قصے سنا سنا کر پالا ہے۔''

''ہاں......! میری بیٹی بھی ہائی سکول میں چلی گئی ہے۔''

تابش بولا۔

''گو میری بیوی جرمن ہے مگر میں نے ہر طرح سے اسے باور کرایا ہے کہ پاکستانی بیویاں وفا کی پتلیاں ہوتی ہیں۔ دوسری شادی کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی ہیں۔ اب میں اسے کیسے سمجھاؤں گا کہ میری ماں اس

عمر میں شادی کرنے پر تل گئی ہے۔ جبکہ اس کی اللہ اللہ کرنے کی عمر شروع ہوگئی ہے۔"

تسمیہ کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اس نے بولنا چاہا مگر گولے اس کے گلے میں پھنسنے لگے۔

"ماما......!"

اس کو اس کیفیت میں دیکھ درمان بولا۔

"استغاثہ کے وکیل آپ پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہے ہیں۔ اپنی صفائی میں کچھ تو بولو......!"

"بیٹا......! میرے وکیل صفائی اس وقت تو تم ہو۔تم ہی کچھ کہہ دو۔"

درمان نے سیدھا ہاتھ کھڑا کیا اور بلند آواز سے کہنے لگا۔

' ہماری ماما نے تیس برس ایک اذیت ناک زندگی گزاری ہے اور یہ سب اس نے ہمارے لئے کیا تھا۔ اس لئے میرا فیصلہ ہے کہ اب ماما کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق دیا جائے۔ ان کی جتنی بھی عمر باقی ہے، ان کی اپنی ہے اور ہمیں ان کی خواہشوں کے راستے میں دیوار نہیں کھڑی کرنی چاہئے۔"

"بکواس بند کرو دانی......!"

تسمیہ نے اسے ڈانٹا۔

"میں ساری رات سوچتی رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنے شوہر کو کیسے بتاؤں گی کہ اس بڑھاپے میں میری ماں سیج سجانا چاہتی ہے اور میں اپنے بچوں کو یہ خبر کیسے سناؤں گی کہ میں تمہاری نانی کی شادی کا

دعوت نامہ لائی ہوں۔ میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہوگئی ہوں۔

افوہ......! میں تو برداشت ہی نہیں کر سکتی یہ سب......!

ماما......!"

اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اگر آپ اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو میں آپ سے قطع تعلق کر لوں گی۔ آپ کے مرنے پر بھی آپ کی صورت دیکھنے بھی نہیں آؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"ماما......! میں تسمیہ باجی سے اتفاق کرتا ہوں۔"

فوراً تابش بول اُٹھا۔

"یہ ٹھیک ہے......آپ کی گزشتہ زندگی بہت کرب ناک تھی۔ مگر اب آپ اپنی آخری زندگی عبرت ناک بنانا چاہتی ہیں۔ میں اپنے مؤقف کے لئے مزید دلائل تو نہیں دوں گا مگر یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کے جنازے کو کاندھا دینے کے لئے کم از کم میں نہیں آؤں گا۔

باقی یہ کہ آپ کے احسانات ہیں ہم سب پر......تو کون سی ماں ہے جو اپنے بچوں کی خاطر شوہر اور زمانے کے ستم نہیں سہتی......؟ دنیا کی ہر ماں کم وبیش ایسی قربانیاں دیتی ہے لیکن وہ اپنے بچوں سے اس کی قیمت طلب نہیں کرتی۔

ماما......! ہم تمہارے ایثار اور صبر کی ہمیشہ عزت کرتے تھے اور تمہاری قربانیوں پر فخر کرتے تھے۔ مگر ماما......! ہم سے ان قربانیوں کی اس طرح قیمت نہ مانگو کہ ہمارا تمہارا رشتہ ہی ٹوٹ جائے۔"

تسمیہ کی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسو وہیں ٹھٹھر گئے۔ اسے یوں لگا جیسے آج وہ ایک نادان لڑکی کی طرح اپنے والدین کی سرزنش میں گھری کھڑی ہے اور ان کے آگے زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہو رہی۔

درمان اس کی خاموشی کو محسوس کر کے بولا۔

''ماما......! یہ دونوں خودغرض ہیں۔ مگر میں ہر دم تمہارے ساتھ ہوں۔''

''تم شادی شدہ نہیں ہو دانی......! تمہیں معلوم نہیں کہ ان لاز (In Laws) کے کیا مسائل ہوتے ہیں۔ خانگی نظام کن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ عزتِ نفس کیا شے ہے۔ اس کا مول کیا ہے۔ ہمیں تو سارے زمانے کا سامنا کرنا ہے۔ ہم تو اس پوزیشن میں نہیں ہیں۔ میرا شوہر بار بار فون کر کے پوچھ رہا ہے کہ آنٹی نے تمہیں کیوں بلایا ہے......؟ ایمرجنسی کیا ہے......؟ کیا بتاؤں اسے کہ بڑھاپے کے عشق کی ایمرجنسی ہے......؟ بس یہی بہانہ بنا رہی ہوں کہ اچانک ماما کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے میں اور زیادہ ٹال نہیں سکتی۔ پرسوں چلی جاؤں گی اور بھول جاؤں گی کہ میری کوئی ماں بھی تھی۔''

وہ کھڑی ہوگئی۔

''مائیں تو اس عمر میں تہجد گزار بن جاتی ہیں۔ تہجد کے حوالے ان کی شناخت بن جاتے ہیں......نا کہ بڑھاپے کا عشق......!''

اس کے ساتھ تابش بھی کھڑا ہوگیا۔

''میں بھی آج انٹرنیٹ پر سیٹ بک کروا لوں گا۔ اس خرافات میں نہ

شامل ہونا چاہتا ہوں نہ رائے دینا چاہتا ہوں۔''

وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکل گئے۔

تسمیہ نے باقاعدہ رونے کے لئے اپنا سر میز پر رکھ دیا۔

درمان دوسری طرف سے آیا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔

''ماما......! غم نہ کرو۔ میں ان دونوں کو سیدھا کر لوں گا۔ میں اب جاتا ہوں۔ دو بجے دوپہر میرا پیپر شروع ہونے والا ہے۔ رات کو تمہارے پاس آؤں گا۔ تم اپنا دل میلا نہ کرو ماما......تم تو ہمیشہ ہمیں تسلی دیا کرتی ہو کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جس کا حل نہ ہو...... اور اب خود......''

''بس دانی......!''

تسمیہ نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''اب تم جاؤ بیٹا......! میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

دانی خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

وہ اُٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آئی۔ جو کچھ اس کے لاڈلے بچوں نے کہا تھا، وہ غیر متوقع تھا۔ مگر عجیب نہیں تھا۔

ائیر ہوسٹس قریب کھڑی اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔

اس نے گھبرا کے آنکھوں پر سے گیلا تولیہ ہٹا دیا۔ تولیے کے ساتھ ی کچھ آنسو بھی چپکے رہ گئے تھے جو بے اختیار گالوں پر لڑھک آئے۔

ائیر ہوسٹس نے تولیہ پکڑ لیا اور بولی۔

''ہم ناشتہ تقسیم کرنے والے ہیں۔ معاف کیجئے......! میں نے آپ کو جگا دیا ہے۔ پہلے آپ ناشتہ کرلیں پھر آرام سے سو جایئے گا۔''

پھر اس نے کھانے کا مفصل مینیو اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

تسبیحہ نے مینیو پکڑ کے چاروں طرف دیکھا۔ جہاز ٹیک آف کر چکا تھا اور اب اپنی سپیڈ پکڑ رہا تھا۔ جہازی کچن سے چمچ اور پلیٹوں کے سجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کھانے کی میزیں کھولی جارہی تھیں۔

وہ اُٹھ کر غسل خانے میں آگئی۔ اپنی روئی ہوئی آنکھوں کو دھویا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جب ناشتہ کی خوشبو سارے کیبن میں پھیلی تو اسے محسوس ہوا۔ واقعی اسے بھوک لگ رہی تھی۔ علی الصبح اسے ائیر پورٹ آنا پڑا تھا۔ مگر یاد نہیں رات کو بھی اس نے کھانا کھایا تھا یا نہیں......؟

اس نے ائیر ہوسٹس سے گرم کافی مانگی۔ پھر ناشتہ کرنے لگی۔

ناشتہ ہوگیا...... برتن سمیٹے گئے...... بتیاں بجھا دی گئیں...... جھروکے بند کر دیئے گئے...... مسافروں نے سیٹیں سیدھی کرنی شروع کر دیں...... تخت ہو یا تختہ، نیند تو آ ہی جاتی ہے۔

تسبیحہ نے بھی اپنی سیٹ دراز کر کے نرم تکیہ سر کے نیچے رکھ لیا۔ جوں ہی سر ٹکایا تو جیسے یادوں کے پچھواڑے کوئی روزن سا کھل گیا۔ گزری ہوئی زندگی کے برسہا برس ذہن جہازی رفتار سے پھلانگنے لگا۔

تسبیحہ بچپن سے پڑھاکو تھی۔ وہ تین بہنیں ہی تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس لئے باپ تسبیحہ کے سر پر دست شفقت رکھ کے کہتا تھا۔ میرا بیٹا ڈاکٹر بنے گا۔

وہ سب سے بڑی تھی۔ ڈاکٹر بننے کا اسے شوق نہیں تھا۔ ابو جی کی خوشنودی کی خاطر چپ رہتی تھی۔ بالآخر اس نے اپنی مرضی ابو پر ظاہر کر دی اور ایف۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد اس نے لائن بدل لی اور انگریزی میں ایم اے کرلیا۔

ابھی وہ آگے کچھ کرنے کا سوچ رہی تھی کہ بدنصیبی سے ایک حادثہ ہوگیا۔ اس کے ابو اور امی کار پر مری سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں ایک بس کے ساتھ ایکسیڈینٹ ہوگیا۔ امی تو موقع پر چل بسیں البتہ ابو جی بچ گئے۔

یوں کہ دونوں ٹانگوں سے مفلوج ہوگئے۔ پھر بھی ان کا دم غنیمت تھا۔ اس نے کالج میں نوکری کر لی۔ چھوٹی بہنوں کا سہارا بن گئی اور باپ کی دعاؤں کے جلو میں چلنے لگی۔

گھر میں ماں نہیں تھی۔ بڑی جلدی اسے ماں کی جگہ سنبھالنی پڑی۔

ابو جی کی تھوڑی بہت جمع پونجی تھی اور یہ گھر جس میں وہ لوگ رہتے تھے، ابو جی نے اچھے وقتوں میں بنا لیا تھا۔

اب بھی ایک خطیر رقم ابو جی کے علاج پہ اٹھ جاتی تھی۔ اس لئے اس نے صبیحہ اور مدیحہ کی شادی گریجویشن کے فوراً بعد کر دی تھی۔ وہ اچھے رشتوں کی تلاش میں رہتی تھی۔

اسے معلوم تھا، ماں سر پر نہ ہو اور والد اپاہج ہو تو لڑکیوں کو کسی آدرش کا سہارا لینے کی بجائے اپنا گھر آباد کر لینا چاہئے۔

صبیحہ اور مدیحہ اپنی گھر گرہستی میں مگن ہوگئی تھیں۔ صبیحہ کا شوہر شارجہ میں ڈائمنڈ کا کاروبار کرتا تھا اور مدیحہ کا شوہر قطر کے ایک بینک میں ملازم تھا۔

یہ سب کام نمٹاتے نمٹاتے دس سال گزر گئے تھے۔ آدمی کے ہاتھ میں مقصد کا چابک ہو اور وہ لگن کے گھوڑے پر سوار ہو تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

البتہ ابو جی بہت ضعیف اور لاچار ہوگئے تھے۔ ان کے لئے ایک ملازم رکھنا پڑتا تھا جو ہمہ وقت ان کی دیکھ بھال کرتا رہے۔

کبھی کبھی رات کو وہ سارے گھر اور کالج کے کام ختم کر کے ابو جی کے پاس بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی تو وہ اپنی بیمار آنکھیں اُٹھا کر لاچار سی آواز میں کہتے۔

"بیٹا......! تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے......؟"

وہ سمجھ تو جاتی تھی مگر آرام سے کہتی۔

"ابو جی......! ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ آج کل میں ڈاکٹریٹ کے لئے تھیسیس لکھ رہی ہوں۔"

"اس سے کیا ہوگا......؟ وقت تو واپس نہیں آئے گا......؟"

"ابو جی......! میرا عہدہ بڑا ہو جائے گا۔ میں پروفیسر سے پرنسپل بن جاؤں گی۔ تنخواہ بڑھ جائے گی۔ آسائشیں مل جائیں گی۔"

"بیٹا جی......!"

وہ تھکی تھکی سانسوں کے ساتھ کہتے۔

"میرے ہوتے ہوئے اپنا گھر بسا لو......!"

وہ دل ہی دل میں ہنستی۔ جیسے گھر بسانا بڑا آسان ہے۔ بازار میں بک رہا ہے۔ سب کچھ اٹھا کے لے آؤں گی اور بسا لوں گی۔

صبح کے فرائض ادا کر کے کالج جانا......

تمام پیریڈ پڑھانا......

شام کو ٹیوشن پڑھانا......

گھر آ کر امتحانوں کے پیپر دیکھنا......

چھٹی کے روز سودا سلف لانا......

لانڈری کرنا......

بستروں کی چادریں بدلنا......

کچن کی خبر لینا......

پھر اگلے دن......

ویسا ہی سب کچھ کرنا......

ان ساری مصروفیات میں گھر بسانے والی شق کہاں ہے......؟

اس نے اپنا تھیسیس مکمل کر کے Submit کر دیا تھا۔ اور ابھی گرمیوں کی چھٹیاں شروع نہیں ہوئی تھیں کہ ایک دن ٹی وی دیکھتے دیکھتے ابو جی ابدی نیند سو گئے۔ ان کو سیدھا گیا تو ان کے ہاتھ میں ایک چٹ تھی جس پر لکھا تھا......

"میری قابل فخر بیٹی......! شادی ضرور کر لینا۔"

❁ ❁ ❁

پی ایچ ڈی کرتے ہی اسے دوسال کا سکالر شپ مل گیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لندن کی طرف سے۔

اس نے گھر کو کرائے پر چڑھا دیا۔ بہنوں کو اطلاع دی اور دو سال کے لئے لندن چلی گئی۔ وہاں جنوبی ایشیاء کے بارے میں جتنے سیمینارز ہوتے یا کانفرنسیں ہوتیں، اسے ان میں شرکت کرنے یا حصہ لینے کا موقع ملتا رہتا۔ یوں بھی اس خطے کے حالات پہ اس کی گہری نظر تھی۔ ٹی وی پر ایسے ٹاک شوز میں بھی وہ حصہ لیتی تھی اور آرٹیکل بھی لکھتی رہتی تھی۔

وہیں ایک سیمینار میں اس کی ملاقات مدہوش صاحب سے ہوگئی۔

ہوا یوں کہ اس روز تیسری دُنیا کے مسائل پر ایک انٹرنیشنل سیمینار ہو رہا تھا اور وہ از خود پاکستان کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس نے اپنے مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ تیسری دُنیا کے صرف تین مسائل ہیں۔

غربت......

صحت ......

اور تعلیم......

مگر اس نے اپنے مقالے کی ترتیب بدل کر تعلیم کو اوّلیت دی اور کہا کہ آج وہ تعلیم اور اس کے مسائل کے بارے میں بات کرے گی۔ اس نے اپنے مقالے میں تیسری دُنیا کے ملکوں خصوصیت سے پاکستان کے مسائل کا اس قدر خوب صورتی سے جائزہ لیا تھا کہ تالیوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور ''واہ واہ'' کے ڈونگرے برسنے لگے۔ بعد ازاں ہر فرد آکے اس کے مقالے کی تعریف کر رہا تھا اور اس کے تجزیے کو حقیقت سے قریب تر کہہ رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شام کو جو سیشن بحث و مباحثے کا ہونا تھا۔ اس میں اسے چیئرپرسن کی کرسی بخشی گئی۔ تین دن کے اس سیمینار میں جسے ایک انٹرنیشنل این جی او نے منعقد کیا تھا، وہ سب کی نظروں کا مرکز بن گئی۔

اس رات ایک لوکل بینک کی طرف سے تمام مندوبین کے اعزاز میں ایک الوداعی ڈنر بھی تھا۔ یہ ڈنر وہاں کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں تھا۔ کھانے کی میزوں پر موم بتیاں جلائی گئی تھیں۔ سیمینار کے سب ارکان سٹیج پر براجمان تھے اور سب کو دو دو منٹ کے لئے مائیک پر آکر بات کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔

اس کا نام پکارا گیا۔ وہ آئی تو اناؤنسر نے پوچھا۔

''یقین نہیں آتا کہ آپ پاکستان سے آئی ہیں......؟''

''کیوں......؟''

''اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اعلیٰ تعلیم یافتہ، حاضر جواب، شائستہ اور خود اعتمادی سے بھری ہوئی عورت پاکستانی نہیں ہوسکتی۔''

اس نے فوراً پہچان لیا کہ اناؤنسر پاکستانی تھا۔ اس لئے بولی۔

''میرا خیال ہے آپ کو پاکستان سے نکلے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔ ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ آج پاکستان کی عورتیں ہر شعبۂ زندگی میں بے مثال خدمات انجام دے رہی ہیں۔ پاکستانی عورت آج ہر چیلنج کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ میں جیسی بھی آپ کو نظر آرہی ہوں، یہ مجھے پاکستان نے بنا کر بھیجا ہے۔ آئندہ پاکستانی عورت کو انڈر ایسٹی میٹ (Under Estimata) کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔''

اس نے اس جذبے سے کہا کہ پھر تالیوں سے ہال گونج اُٹھا۔

جب وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھی تو ملائشیا کے مندوب نے آکر مبارک باد دی اور کہا۔

''آپ جیسی خاتون کو پاکستان ہائی کمیشن میں ہونا چاہئے۔''

''میں جہاں ہوں وہاں بھی سفارت کاری کر رہی ہوں۔''

اس ہنس کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

کھانے کی میز پر بہت سے لوگ آکر ملتے رہے۔ کارڈز کے تبادلے ہوتے رہے۔

ایک بہت ہی خوب صورت جوڑا قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

اپنا تعارف کرایا۔ مرد پاکستانی تھا اور عورت امریکن تھی۔

وہ دونوں بوسٹن سے یہ سیمینار اٹینڈ کرنے آئے ہوئے تھے۔

مرد اتنا ہینڈسم تھا کہ تسمیحہ کو دوسری بار نظر اُٹھا کر اسے دیکھنا پڑا۔ اس محویت میں اس نے ان کے نام بھی ٹھیک طرح سے نہیں سنے۔ بس دل میں

یہ سوچا کہ یہ امریکن عورتیں کتنی سیانی ہوتی ہیں۔ اتنے خوب صورت مرد کو ہاتھ سے کب جانے دیتی ہیں......؟ مرد کا سراپا جیسے اس کے ذہن میں ٹھہر سا گیا۔

اتنے میں ایک اور مرد آ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کے کش لگاتا ہوا بولا۔

”میرا خیال ہے اب تعارف ہو ہی جائے......!“

”آج شام آپ سٹیج پر اناؤنسمینٹ کر رہے تھے۔ تعارف کے لئے اتنا ہی کافی نہیں......؟“

”نہیں......!“

”تو باقی تعارف آپ کرا دیں۔“

”میں مدہوش ہوں۔“

”جی......!“

تسبیحہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”یو مین اِٹ (You mean it)“

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”واقعی آپ بہت ذہین ہیں۔ میرا نام مدہوش ہے۔ اے۔ کے۔ مدہوش۔“

”یہ نام ہے کہ تخلص ہے......؟“

”آپ تخلص کہہ سکتی ہیں مگر میں شاعر، ادیب کچھ نہیں ہوں۔ سیدھا سادھا صحافی ہوں۔“

اسے چپ دیکھ کر بولا۔

”یہاں لندن میں ایک پاکستانی انگلش نیوز پیپر نکلتا ہے۔ میں اس کا ریڈیڈنٹ ایڈیٹر ہوں۔“

”کون سا پیپر......؟“

تسبیحہ نے پوچھا۔

”پراوڈ پاکستان......! (Proud Pakistan)“

”اچھا اچھا......! میں جب سے لندن آئی ہوں، پاکستانی خبروں کے لئے میں بطور خاص اس اخبار کو پڑھتی ہوں۔ اس کے ایڈیٹوریل لاجواب ہوتے ہیں۔“

”تو میں اس کو Compliment سمجھوں......؟“

”یعنی......؟“

اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ذرا سا جھک کر کہا۔

”ایڈیٹوریل یہی خاکسار ہی لکھتا ہے۔“

”تو پھر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔“

تسبیحہ نے سادگی سے جواب دیا۔

”یہاں ایک اُردو چینل ہے۔ میں اس کا اینکر پرسن بھی ہوں۔ ایک درخواست لے کر آیا تھا کہ آپ میرے چینل پر تشریف لائیں اور اپنے پاکستانیت سے لبریز خیالات سے پاکستانی پردیسیوں کو آگاہ کریں۔“

”مگر میں......“

”اگر مگر کچھ نہیں......! سٹیج پر آپ نے جس طرح مجھے چپ کرایا تھا۔ اس کا تقاضا ہے کہ آپ کی باتیں اوورسیز پاکستانیوں کو سنوائی جائیں۔ اب

تکلف وغیرہ میں نہیں سنوں گا۔ کیونکہ میں یہ کام زور زبردستی بھی کروا لیتا ہوں۔''

وہ ہنسنے لگی۔

''مجھے دھمکائیں نہیں......! دن اور وقت بتائیں......!''

دن اور وقت طے کر کے وہ چلا گیا۔

اس کا انٹرویو ٹی وی پر چلا۔ لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس کی دونوں بہنوں نے بھی اپنے اپنے ملک سے فون کر کے اسے مبارک باد دی۔ اس کے بعد دوسرے چینلز سے بھی اسے دعوت نامے آنے لگے۔

ایک روز وہ یونیورسٹی سے باہر نکل رہی تھی کہ سامنے مدہوش صاحب مل گئے۔

''آپ یہاں کیسے......؟''

وہ بولی۔

''آپ سے ملنے آیا تھا۔''

وہ چپ چاپ ساتھ چلنے لگی۔

''آپ کے لئے کچھ اخباروں کے تراشے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اور اس روز کے انٹرویو کی DVD بھی دینی ہے۔ وعدہ جو کیا تھا۔''

''کہاں ہے......؟''

وہ بولی۔

''آج تو صرف اطلاع دینے آیا ہوں۔ چند منٹ عنایت کر دیں۔ بلکہ میرے ساتھ کھانا کھائیں یا چائے پئیں۔ پھر کسی دن سب چیزیں لے

آؤں گا۔''

گو وہ اجنبیوں کے ساتھ چائے پینے یا کھانا کھانے کی قائل نہیں تھی، تھوڑی سی رد و کد کے بعد آمادہ ہوگئی۔

مدہوش صاحب اسے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں لے آئے۔ اس نے صرف چائے کی دعوت قبول کی تھی۔ وہ بھی مروتاً محض شکریہ ادا کرنے کے لئے۔

وہاں بیٹھ کر بہت سے موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

مدہوش صاحب نے اس کا کارڈ دیکھ کر پوچھا۔

''یہ جو تسمیہ ربانی لکھا ہے، تو کیا ربانی صاحب آپ کے شوہر ہیں......؟''

''نہیں......!''

وہ ہنسنے لگی۔

''یہ میرے والد صاحب کا نام ہے۔ ساتھ ''مس'' بھی تو لکھا ہے۔''

''اب ہم لوگ لفظ ''مس'' پر یقین نہیں رکھتے۔ کیونکہ یہاں طلاق یافتہ عورتیں بھی اپنے نام کے ساتھ پھر سے ''مس'' لگا لیتی ہیں۔''

''آپ نے شادی نہیں کی......؟''

وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔

''فرصت ہی نہیں ملی۔''

''کیا شادی کرنے کے لئے فرصت کی ضرورت ہوتی ہے... ؟''

''ہاں......! شادی کے بارے میں سوچنے کے لئے فرصت چاہیے۔''

مگر میں نے کام اتنے شروع کر رکھے ہیں کہ ابھی سوچنے کی باری نہیں آئی۔"

"یا یہ کہ ابھی کوئی ایسا ملا نہیں کہ جسے دیکھ کر آپ شادی کا سوچیں......؟"

وہ بولا۔

"یہ بھی درست ہے۔"

یہ کہہ کر تسبیحہ نے چائے کی پیالی منہ سے لگائی۔

اسی وقت ہوٹل کی لابی سے وہ جوڑا گزرا جس کا انتہائی خوبرو شوہر پاکستانی تھا اور بیوی امریکن تھی۔ تسبیحہ کی نگاہ سیدھی ان کی طرف گئی اور پھر پلٹ کر آنا بھول گئی۔

مرد کالے ڈنر سوٹ میں بہت ہی سمارٹ لگ رہا تھا۔ آج اس نے غور کیا، مرد کی کن پٹیوں پر سفید بال تھے۔ وہ سوچنے لگی۔ غالباً کتابوں میں لکھے ہوئے یونانی شہزادے یا اطالوی مجسمے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ اس نے اتنا وجیہہ مرد آج تک پاکستان میں نہیں دیکھا تھا۔

"قدرت بھی کتنی بے نیاز ہے۔ کیسے جوڑے بناتی ہے......؟ پاکستان کا ایک دلکش مرد امریکن عورت کی قسمت میں لکھ دیتی ہے۔"

مدہوش صاحب نے اس کی آنکھوں کے تعاقب میں جا کر اس جوڑے کو دیکھا۔ جب وہ جوڑا باہر نکل گیا تو وہ اپنے آپ میں آ گئی۔

مدہوش صاحب بولے۔

"آپ اس مرد کے حسن کو سراہ چکی ہوں تو میں بات کروں......؟"

وہ چونک گئی۔

"کیسا خطرناک شخص ہے۔ ذہن کی چوریاں پکڑتا ہے۔"

دل میں تو وہ متاثر ہوئی مگر بڑے سبھاؤ سے بولی۔

"ہاں......! میں اس جوڑے کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ دونوں میاں بیوی انتہائی حسین ہیں۔ عام طور پر ایسے جوڑے کم نظر آتے ہیں۔"

"معلوم نہیں......!"

وہ بولا۔

"میں اس میدان میں پیدل ہوں۔"

"آپ اس ملک میں کب سے ہیں......؟"

وہ بھی بات بدل کر بولی۔

"یاد نہیں......! کچھ یاد نہیں......! اب تو ایسے لگنے لگا ہے کہ پیدا بھی یہیں ہوا تھا۔"

"آپ کے بیوی بچے کہاں رہتے ہیں......؟"

اس نے پھر پوچھا۔

"کہیں نہیں رہتے۔"

وہ بولا۔

"آپ نے شادی کی......؟"

اس نے پوچھا۔

"جی ہاں......!"

وہ بولا۔

"دو مرتبہ......!"

''دو مرتبہ......؟''

وہ حیرت سے بولی۔

''تو کہاں ہیں بیویاں......؟''

''ایک کو میں نے چھوڑ دیا...... دوسری مجھے چھوڑ گئی۔''

یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

''آپ تو ایسے ہنس رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں......؟''

''بالکل ایسے جیسے آپ نے پہلے کہا تھا کہ آپ کو سوچنے کی فرصت نہیں...... مجھے ان حالات پر غور کرنے کی فرصت نہیں...... کام میں لگا رکھا ہے اپنے آپ کو۔''

''کبھی پاکستان جاتے ہیں......؟''

اس نے پوچھا۔

''جاتا ہوں۔ کبھی اخبار کی طرف سے بلوایا جاتا ہوں۔ کبھی دوست کسی تقریب پر بلا لیتے ہیں۔''

''اچھا...... اب میں چلوں......؟''

وہ کھڑی ہوگئی۔

''آپ جب تک یہاں ہیں، ملتی رہئے گا۔''

وہ بھی کھڑا ہوگیا۔

''آپ کے ساتھ بیٹھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے کچھ سیکھا ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔

''یوں ہی حسنِ ظن ہے آپ کا۔''

تو اس کے جواب میں، میں کہوں کہ حسنِ زن تو حضور آپ کا ہے۔''

دونوں ہنسنے لگے۔

اس کے بعد بھی کبھی کسی کانفرنس میں یا سیمینار میں اس کی مدہوش صاحب سے ملاقات ہو جاتی۔ ورنہ وہ انٹرنیٹ پہ کوئی پیغام بھیج دیتے۔ کبھی وہ ان کا ایڈیٹوریل پڑھ کے ای میل بھیج دیتی۔

❀ ❀ ❀

جب تسمیہ کے دو سال مکمل ہوگئے تو آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے اسے ایک سال کے لئے جاب کی آفر ہوئی جو یونیورسٹی کے ایجوکیشن ریسرچ سنٹر میں تھا۔

اس نے یہ آفر قبول کر لی۔ کیونکہ یہ جاب کر لینے سے اس کی قابلیت کے ساتھ ساتھ آمدنی میں بھی اضافہ ہونا تھا۔

دو ڈگریاں اور بہت سارا تجربہ لے کر جونہی وہ پاکستان پہنچی، اسے ایک پرائیویٹ ڈگری کالج میں پرنسپل شپ کی آفر ہوگئی۔ یہ بہت پُرکشش آفر تھی۔ خاطر خواہ تنخواہ کے ساتھ الاؤنسز، ایک گھر، ایک موٹر اور بڑا عملہ......

اس نے اس آفر کی تائیدِ غیبی جانا اور بتیس برس کی عمر میں ایک بہت بڑے کالج کی پرنسپل بن گئی۔

اس کی اس پوزیشن کا جشن منانے کے لئے دونوں بہنیں بہنوئی اور بچے پاکستان آگئے تھے اور کالج سے دی گئی نئی رہائش گاہ میں اس کے ساتھ ہی رہے تھے۔

چند دن ہنسی خوشی گزر گئے۔ جاتے ہوئے دونوں بہنوں نے کہا۔

''آپا......! آپ شادی ضرور کرنا۔ ابو جی کی بھی یہی خواہش تھی۔''

بہنوئیوں نے بھی تاکید میں ہاں ملائی۔

''بھئی......! شادی تو نصیبوں سے ہوتی ہے۔ اگر میرے نصیب میں ہے تو ضرور ہو جائے گی۔''

نئے کالج کو اس نے نئی توانائی اور نئے مشن کے ساتھ چلانا شروع کر دیا۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں کی شہرت دُور دُور پھیلنے لگی۔

ایک روز وہ دفتر میں بیٹھی تھی۔ چپڑاسی ایک کارڈ لے کر اندر آیا۔

اس نے کارڈ کو دیکھا۔

ایک بار...... دو بار...... پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بھیج دو اندر......!''

اس نے سر اُٹھا کر چپڑاسی سے کہا اور میز پر پھیلے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف رکھنے لگی۔

سلام اور شکریہ ایک ساتھ...... وہ آتے ہی دھماکے سے بولا...... اور سامنے پڑی کرسی پر ازخود بیٹھ گیا۔

''محترمہ......! میرا تو خیال تھا آپ مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گی۔ اور پی۔ اے سی کہیں گی...... اسے دھکے مار کر باہر نکال دو......!''

وہ اپنے انداز میں بولتا گیا۔

''کیوں......؟ آپ نے کوئی ایسا جرم کیا ہے......؟''

وہ ہنس کر بولی۔

''پاکستانی عورتوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔''

وہ بولا۔

''کہ کب......''

''مدہوش صاحب......!''

وہ زور سے بولی۔

''اس وقت آپ پاکستان میں ہیں۔ ہوش میں رہ کر بات کریں۔''

اس پر اس نے قہقہہ لگایا۔

''ویسے آپ بتائیں...... آپ نے مجھے ڈھونڈا کیسے......؟''

''میں صحافی ہوں۔ بندے کو تحت الثریٰ سے بھی نکال لاتا ہوں۔ آپ کو ڈھونڈنا کون سا مشکل تھا......؟''

''پھر بھی...... ممنون ہوں کہ آپ نے ایک سال بعد بھی مجھے یاد رکھا۔''

''بھئی......! آپ کوئی بھول جانے والی چیز ہیں......؟''

اس نے چائے کی پیالی پکڑ لی جو چپڑاسی لوازمات کے ساتھ لے آیا تھا۔

چپڑاسی کے جانے کے بعد تسبیحہ نے پوچھا۔

''پاکستان کس سلسلے میں آنا ہوا......؟''

''آپ ہی کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''کیا کسی بچی کو داخلہ دلوانا ہے......؟''

''توبہ......! یہ تعلیم یافتہ عورتیں...... آسانی سے بات سمجھتی ہی نہیں۔''

وہ اس کا چہرہ دیکھتی ہوئی بولی۔

''تو پھر آپ خود سمجھا دیں......!''

چائے ختم کر کے اس نے پیالی رکھ دی۔

''اللہ کی بندی......! ایک شخص لندن سے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے، پاکستان کے اندر شہروں شہروں ایک عورت کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ تو کیا وہ پاگل ہے......؟''

تسبیحہ خاموش رہی اور اس کے چہرے کو کھوجتی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

''محترمہ......! آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ آپ بڑی ظالم شئے ہیں۔ آپ نوکِ خنجر کی طرح دل میں کھب جاتی ہیں۔ نہ نکالتے بنتی ہے نہ رکھتے بنتی ہے...... میں اپنے آپ کو بڑا گھسا پٹا، جہاندیدہ آدمی سمجھتا تھا۔ عورت ذات کو اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔ اپنے آپ کو سمجھاتے سمجھاتے ایک سال گزر گیا۔ دل مانا ہی نہیں تو سوچا چل کے قسمت آزماتے ہیں۔ اگر محترمہ کو ابھی تک سوچنے کی فرصت نہیں ملی تو سوچ ڈال دیتے ہیں۔ یعنی سوال ڈال دیتے ہیں۔ غریب الوطنی سمیت اپنی مفلسی اور درماندگی پیش کر دیتے ہیں۔''

''یہ...... یہ...... کیا...... کیا کہہ رہے ہیں......؟ مدہوش صاحب......! اس طرح...... اس وقت...... اس مقام پر......''

''کوئی بات نہیں......! کوئی بھلا سا وقت اور مقام بتا دیجئے۔ میں وہاں آکر آپ کو پروپوز کر دیتا ہوں۔ بزرگ آپ کا بھی کوئی نہیں اور میرے عزیزوں میں بھی میری گواہی دینے والا کوئی نہیں آئے گا۔ وقت ہم دونوں کے پاس کم ہے...... تو مزید وقت ضائع کرنے سے فائدہ......؟''

تسبیحہ اسے محض مذاق سمجھ رہی تھی۔ مگر اس کے اس منفرد قسم کے انداز

نے اسے متاثر بھی کیا تھا۔

اس کے بعد مدہوش صاحب کئی بار اسے ملنے اس کے گھر آئے اور صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کئے بنا جائیں گے نہیں۔

ایک مہینے کی ہاں اور ناں اور سوچ بچار کے بعد تسمیہ نے اپنی دونوں بہنوں کو مدہوش صاحب کے بارے میں سب کچھ بتا کر ان سے مشورہ مانگا۔

وہ دونوں اس رشتے سے بہت خوش تھیں کہ اس قسم کے صاف گو آدمی صاف باطن ہوتے ہیں۔ اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ حتیٰ کہ اپنی حقیقت بھی بتا دی۔ اس لئے تسمیہ کو اب شادی کر لینی چاہئے۔

ان کے روز روز کالج آنے جانے سے بھی تسمیہ خوف زدہ تھی۔ لوگوں کی زبانیں کون پکڑ سکتا ہے۔

یہ سوچ بھی دامن گیر تھی کہ چونتیس برس کی عورت کو کنوارہ مرد مشکل سے ملے گا۔ عمر کا تقاضا ہے کہ جو مل رہا ہے اس پر قناعت کر لے۔

اور پھر مدہوش صاحب کی طلب میں ایک والہانہ پن اور بے ساختگی بھی تھی جسے ہر عمر میں ہر عورت پسند کرتی ہے۔

اس کا عندیہ پا کر دونوں بہنیں بچوں کو لے کر آ گئیں۔ بعد میں دونوں بہنوئی بھی آ گئے۔ اس کی مصروف اور اُجاڑ زندگی میں رنگوں کی برسات ہونے لگی۔ سب نے بڑی خوش اسلوبی اور اعزاز کے ساتھ اپنی عظیم آپا کی شادی عبدالکریم مدہوش کے ساتھ کر دی۔ گو مدہوش صاحب اپنی شخصیت اور شکل وصورت سے بالکل متاثر نہیں کرتے تھے مگر باتیں بہت لاجواب کرتے تھے۔

حسِ مزاح تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

صبیحہ اور مدیحہ کو کبھی نام سے نہیں بلاتے تھے۔ ہمیشہ چھوٹی سالی اور بڑی سالی کہہ کر بلاتے تھے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ان کے شوہروں کو بلا کر کہنے لگے۔

"اے خوش بخت شوہرو......!

اپنی اپنی بیویوں کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ ہمہ وقت میرے سر پر سوار رہتی ہیں اور مجھے اپنی اکلوتی اور نئی نویلی بیوی کے ساتھ ہنی مون منانے نہیں دیتیں۔"

اس پر سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

تاہم ان کو تو جانا ہی تھا۔ ایک ماہ یہاں گزار کر سب اپنے مسکن کو لوٹ گئے۔

ان کے جانے کے بعد مدہوش صاحب، تسمیہ کو باقاعدہ ہنی مون پر ناران لے گئے۔ وہیں دریائے کنہار کے کنارے پر انہوں نے ایک کمرے والی ہٹ (Hut) کرائے پر لے لی تھی۔ وہ سارا دن دریا کے کنارے بیٹھے رہتے۔ تسمیہ کی تصویریں بناتے رہتے۔ اس کے لمبے بالوں کی تعریف کرتے۔ اس کے جسمانی خطوط کے قصیدے پڑھا کرتے۔ ہمیشہ ان کے لئے وہ باقاعدہ اچھے کپڑے پہن کر دلہن کے روپ میں بنی سنوری رہتی۔ انہیں اس کا یہ روپ بہت اچھا لگتا تھا۔

کبھی شدتِ جذبات سے کہتے۔

"تم نے زندگی بھر ایسے ہی رہنا ہے۔ میں تمہیں بوڑھا نہیں ہونے

دوں گا۔"

وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی۔

"بھلا کوئی ہمیشہ جوان رہتا ہے......؟"

وہ کہتی۔

"تم رہو گی۔ میں تمہیں دکھا دوں گا۔"

"جب بچے ہوتے ہیں تو عورت کا روپ لے جاتے ہیں۔"

بچے بچے...... یہ کیا کہتی رہتی ہو......؟ مجھے بچوں کی ذرا بھی طلب نہیں۔"

"مگر عورت کو ہوتی ہے۔ بچے کے بغیر اس کی ذات مکمل نہیں ہوگی۔"

"یار......! کون مکمل ہوا ہے اس دُنیا میں......؟ یوں ہی عورتیں ایک محاورہ سا بنا لیتی ہیں۔"

"جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو مجھے تم سے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"چلو اُٹھو......! تمہاری تصویریں بنائیں۔ آج سارے Profile بناؤں گا۔ تم نے اپنے پروفائل کبھی دیکھیں ہیں۔ قیامت لگتی ہو، قیامت......!"

تسبیحہ کو اکثر یوں لگتا جیسے یہ سب خواب میں ہو رہا ہے۔ وہ خواب میں دیکھ رہی ہے، اور خواب میں سن رہی ہے۔ وہ تو زندگی کی جس ڈگر پر چل نکلی تھی، وہاں صرف فرائض کی بجری بچھی ہوئی تھی اور سخت کوشی کی خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔ یکا یک پتھروں میں سے پھول نکل آئیں گے۔ اس

کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

کبھی کبھی وہ کانپ جاتی۔ جیسے ابھی نیند کھل جائے گی اور منظر نامہ بدل جائے گا۔ جب مدہوش صاحب پل پل اس پر فدا ہوتے۔ اس کے حسن کے ہر زاویے کو خوب صورت لفظوں میں بیان کرتے۔ اس کی کوئی بات نہ ٹالتے۔ سوتے جاگتے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ یوں جیسے انہوں نے اسے پھولوں کی طرح ہتھیلی پر اُٹھا رکھا ہے۔ تو وہ اپنی اس غیر یقینی خوابی کیفیت کا اظہار کر دیتی۔ جس کے جواب میں وہ ہمیشہ کہتے۔

"مجھے تو یوں لگا ہے جیسے میں اب دُنیا میں آیا ہوں۔ پہلے یوں ہی جھک مارتا پھرتا تھا۔ شاید تم تک پہنچنے کا راستہ یوں ہی طے کرنا تھا......؟"

یا کبھی کہتے۔

"پتہ نہیں میری کون سی نیکی کام آ گئی کہ تم اچانک مجھے مل گئیں۔ جی چاہتا ہے اب کچھ بھی نہ کروں۔ یوں ہی باقی عمر تمہارے قدموں میں پڑا رہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باقاعدہ اس کے گورے گورے سبک سے پاؤں چوم لیتے۔

"ارے......! یہ کیا کر رہے ہیں......؟ مجھے گناہگار کر رہے ہیں۔"

تو وہ کہتے۔

"پاگل ہوتی ہیں عورتیں...... راحت کو گناہ کہتی ہیں۔"

اور کبھی سگریٹ کا کش فضا میں چھوڑ کر یوں کہتے۔

"تمام عمر تیرا انتظار ہم نے کیا

اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا“

اور وہ جب ہنستے ہنستے کہتی۔

”ذرا ”کس کس“ کی تفصیل تو بیان کریں۔

تو وہ ایک اور کش لے کر کہتے۔

”میں تو Kiss......Kiss کی بات کر رہا ہوں۔ Kiss کا حساب تو شاید تم بھی نہیں رکھ سکو گی۔“

تو وہ ایک دم شرما جاتی۔

تسمیہ اتنا کبھی نہیں ہنسی تھی جتنا ان دنوں ہنستی تھی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک دلربا سی مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔ وہ خوب صورت کپڑے پہننے لگ گئی تھی۔ اسے ہار سنگھار سے دلچسپی ہوگئی تھی۔

جب وہ اپنی چھٹیاں گزار کر کالج میں واپس آئی تو وہ ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔ زندگی کے بارے میں اس کا فلسفہ ہی بدل گیا تھا۔ سارا کالج اس مثبت تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا تو سبھی دوست اسے مبارک باد دے رہے تھے اور اس کی خوش نصیبی پر رشک کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

دو مہینے تو وہ ایک سرور و کیف کی دُنیا میں رہی۔ پھر اچانک اسے پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

سب سے پہلے یہ خبر اس نے اپنی بہنوں کو سنائی۔ ان کے لئے یہ ایک غیر متوقع اور انتہائی حسین خوش خبری تھی۔ مدہوش صاحب فوراً اس کی اس خوشی میں شریک ہوگئے۔ کیونکہ وہ یہی دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اس کی خوشنودی کی خاطر بقایا زندگی بسر کریں گے۔

اگلے چھ ماہ وہ اس کے گھر میں مقیم رہے۔ قدم قدم پر اس کا دھیان رکھتے۔ اپنے ہونے والے بچے کے حوالے سے مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے۔ ایک دن انتہائی غور و فکر کی صورت بنائے سگریٹ کے مرغولوں میں ڈوبے ہوئے تھے کہ تسمیہ آگئی اور بولی۔

”خیر ہے......! آج آپ بہت سنجیدہ لگ رہے ہیں......؟ کس سوچ میں غرق ہیں......؟“

”جانِ من......! شادی اور بچہ ہر مرد کو سنجیدہ بن جانے کی تلقین کرتے ہیں۔“

”پھر بھی مسئلہ تو بتائیں......!“

”میں اب مستقلاً پاکستان آجانا چاہتا ہوں۔“

”تو اس میں اڑچن کیا ہے......؟“

”کاروبار......!“

وہ سر ہلا کر بولے۔

”کاروبار......! ملازمت......؟ روزگار......؟“

”لندن میں میری ملازمت ہے۔ اچھی تنخواہ ہے۔ اخبار والوں سے میں نے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں پاکستان میں نہ مجھے اتنی تنخواہ مل سکتی ہے نہ ویسی مراعات...... مجھے ہر صورت لندن ہی جانا ہوگا۔“

”پھر......؟“

وہ ان کی آنکھوں میں کچھ کھوجتی ہوئی بولی۔

”پھر...... ظالم حسینہ......! کوئی کافر ہی ہوگا جو تم سے دُور رہ سکے گا۔

اب دل بے چارہ تمہارے آنچل کے سائے میں ہی رہنا چاہتا ہے۔"

"اچھا اچھا......! ڈائیلاگ نہ بولیں، اس کا حل نکالیں۔"

"ہاں......! اسی سوچ میں پڑا رہتا ہوں۔ وہ تین پروگرام میں نے سوچے ہیں۔ کچھ دوستوں سے بھی ملا ہوں۔ ابھی تم سے مشورہ کرنا باقی ہے۔"

"تو بتائیں نا......!"

وہ مصر ہوئی۔

"ہم تین دوستوں نے باہم تعاون سے ایک نیا اخبار نکالنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"مگر تم جانتی ہو کہ آجکل کمپیٹیشن اتنا زیادہ ہے کہ اخبار لانچ کرنے کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوگی۔ میرے دونوں دوست سرمایہ دار ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ابتداء میں اگر ہم تینوں ایک ایک کروڑ روپیہ لگا دیں تو یہ ممکن ہوسکتا ہے۔"

"اور آپ نے کیا کہا......؟"

"ہاں......! آپ کے "آپ" جو ہیں وہ کنگال ہیں۔ نقرے ہیں۔ بیوی کے گھر پڑے ہوئے ہیں۔ تم سے پہلے جو کمایا اُڑا دیا۔ یوں......"

انہوں نے راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر بتایا۔

"واقعی......! ایک کروڑ تو بہت زیادہ رقم ہے۔"

"زیادہ تو ہے۔"

وہ چھت کی طرف دیکھ کر بولے۔

"لیکن اگر مجھے پچاس لاکھ کہیں سے اُدھار مل جائیں تو باقی پچاس لاکھ اپنی گاؤں والی بچی کھچی جائیداد بیچ کر جمع کرلوں گا۔ لندن میں ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ گاؤں میں تھوڑی سی آبائی زمین ہے......"

پھر انہوں نے فقرہ اُدھورا چھوڑ دیا۔ اتنے میں فون بجا اور تسبیحہ فون سننے چلی گئی۔ بات وہیں رہ گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جب وہ ڈاکٹر سے چیک اَپ کروا کے واپس آکر لیٹی ہی تھی، وہ اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولے۔

"جانِ تمنا......! تم نے میرے مسئلے کا حل پیش نہیں کیا۔"

"کون سا مسئلہ......؟"

"واہ بھئی واہ......! اس دن جو اتنی مروّت سے میری پریشانی کا پوچھ رہی تھیں...... اور میں نے اخبار کے اجرا کی بات کی تھی۔"

"لو بھلا......! میں ان مسائل کا حل کیا جانوں......؟"

"معصوم نہ بنو......!"

وہ لگاوٹ سے بولے۔

"تم تو ایسا امرت دھارا ہو جو ہر مسئلے کو چٹکی میں حل کر دیتا ہے۔"

"اچھا......! اب آپ مجھے بے وقوف نہ بنائیں۔"

وہ بولی۔

"میں قسمیہ کہتا ہوں۔ میرا یہ مسئلہ تم ہی حل کر سکتی ہو"

"کیسے......؟"

"کم از کم پچاس لاکھ تو تمہاری اپنی

''نہیں صاحب......!''

وہ جلدی سے بولی۔

''میں ایک مزدور پیشہ عورت ہوں۔ میرے پاس اتنی رقم کہاں......؟ میں نے بینک سے اُدھار لے کر دونوں بہنوں کی شادی کی تھی۔ لندن سے واپسی پر جو رقم لائی تو وہ اُدھار بمعہ سود ادا کر دیا۔ اب تو صرف تنخواہ پر گزارا ہے۔''

''تمہاری کوئی جائیداد ہے......؟''

''ہاں......! ابو جی نے اپنا گھر میرے نام لگا دیا تھا۔ جب میں نے امی جی کے تمام زیورات بہنوں کو دے دیئے اور بینک سے بھی قرض لے لیا۔ تب ابو جی نے اپنی زندگی میں ہی میں یہ فیصلہ کر دیا کہ یہ گھر میرے نام رہے گا۔ بہنوں نے بھی حامی بھر لی تھی کہ وہ اس میں سے کبھی حصہ نہیں مانگیں گی۔ بس وہ میرے نام ہے۔''

''کتنے کا ہوگا وہ گھر اندازاً......؟''

وہ بڑی ملائمت سے بولے۔

''جتنے کا بھی ہو......''

وہ درشتی سے بولی۔

''وہ میرے ابو جی کی آخری نشانی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بیچوں گی۔''

''ہاں......! وہ رہن تو رکھا جا سکتا ہے......؟''

''جی نہیں......! اوّل تو مجھ میں اتنی ہمت ہی پیدا نہیں ہوگی کہ میں

اسے رہن رکھوں اور پھر خدا جانے اسے چھڑانے کی توفیق ملے یا نہیں۔''

اس گفتگو کے بعد مدہوش صاحب کافی دن تک خاموش رہے۔ بلکہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ پوچھنے پر سپاٹ لہجے میں بتا دیتے کہ پیسوں کا بندوبست کرنے کے لئے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ پھر ایک روز انہوں نے آ کر بتایا کہ انہیں لندن سے کال آ گئی ہے۔ وہ لوگ زیادہ چھٹیاں دینے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اسے فی الفور لندن واپس جانا پڑے گا۔ سو وہ چلے گئے۔

❀❀❀

تسمیہ زندگی کے نئے تجربے سے گزر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بہت سی احتیاطی تدابیر کی ہدایات دی تھیں۔ کالج بھی باقاعدہ جا رہی تھی اور خوف زدہ بھی رہتی تھی۔ اس لئے آخری مہینے میں اس نے مدیحہ کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

ملیحہ گو تیسرے نمبر پر تھی، اس کے تین بچے تھے اور اس معاملے میں کافی تجربہ کار تھی۔ چنانچہ بچوں کو شوہر کے سپرد کر کے دو مہینوں کے لئے اس کے پاس آ گئی تھی۔

جس دن تسمیہ کی پہلی بیٹی پیدا ہوئی، وہ دن اس کی زندگی میں انتہائی خوشی کا دن تھا۔ وہ ماں بن گئی تھی۔ دُنیا کے سب سے اونچے مینار پر پہنچ گئی تھی۔ اس کی زندگی کی تکمیل ہوگئی تھی۔ ایک مقصد جینے کا اس کے سامنے آگیا تھا۔ اپنی تخلیق کو گود میں لے کر ساری خدائی بانہوں میں آ گئی تھی۔

اس نے بچی کی پیدائش کی اطلاع مدہوش صاحب کو دے دی تھی۔

بچی بالکل تسمیہ کی شبیہ تھی۔ تسمیہ نے اس کا نام تسمیہ رکھ دیا۔

ملیحہ ایک تجربہ کار ماں کی طرح تسمیہ کو بچی سنبھالنے کی ٹریننگ دے رہی تھی۔ تا کہ اس کے جانے کے بعد تسمیہ کو مشکل نہ پیش آئے۔

جب ملیحہ واپس جانے کی تیار کر رہی تھی تو تسمیہ نے اس کو مدہوش

صاحب کے مطالبے کے بارے میں بتا کر مزید مشورہ مانگا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ انکار کرنے کی وجہ سے ان کا موڈ بدلا بدلا سا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کبھی کبھی پریشان ہو کر سوچتی ہے۔ انکار کر کے کہیں غلطی تو نہیں کی۔ مدیحہ نے اسے سمجھایا کہ

”آپا......! آپ نے بہت مناسب روّیہ اختیار کیا ہے۔ ان معاملوں میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔ بے شک بظاہر دُلہا بھائی بہت اچھے ہیں اور آپ سے محبت بھی کرتے ہیں مگر آپ ان کو کس حد تک جانتی ہیں......؟ ابھی ایک سال ہی تو ہوا ہے ان کو آپ کی زندگی میں آئے ہوئے۔ اتنی بڑی رقم دے کر کہیں ساری عمر پچھتانا نہ پڑ جائے۔“

”لیکن ملیحہ......! انکار کر دینے سے تعلقات میں دراڑیں بھی تو پڑ سکتی ہیں۔“

”دراڑیں تو کسی نہ کسی موڑ پر پاٹ جاتی ہیں آپا......! لیکن کوئی آدمی بداعتمادی کرے اور نقصان پہنچا کر بھاگ جائے تو زندگی بہت پیچھے چلی جاتی ہے۔“

یہی بات بعد میں مدیحہ اور اس کے شوہر نے بھی کہی تھی کہ حق مہر تو اس نے شرعی لکھ کر دیا مگر اتنی جلدی اتنی بھاری رقم مانگ لی۔ ذہن میں شکوک وشبہات پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

تسمیہ تین ماہ کی ہوگئی تھی جب مدہوش اسے دیکھنے آئے۔ اس کے لئے بے شمار کپڑے اور کھلونے لے کر آئے تھے۔ اسے گود میں لے کر بہت پیار کیا اور یہ بھی کہا۔

"یہ تو بالکل تمہاری چھوٹی سی تصویر ہے۔"

ایک دن جب وہ باہر سے آئے تو ایک مہر زدہ دفتری سا پرچہ لائے جس پر ثقیل اُردو میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

وہ پرچہ انہوں نے تسمیہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ بولی۔

"یہ کیا ہے......؟"

وہ کہنے لگے۔

"خود ہی پڑھ لو......!"

اس نے غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔

"یہ تو مشکل سی کتابی اُردو لکھی ہوئی ہے۔ مجھ سے نہیں پڑھی جاتی۔ آپ خود پڑھ کر سمجھا دیں۔"

"بس......! یہاں آکر تمہاری تعلیم جواب دے جاتی ہے۔ نیک بخت......! یہ عدالتی کاغذ ہے۔ گاؤں میں میرے حصے کی جو وراثتی زمین تھی، وہ میں نے اپنی بیٹی تسمیہ کے نام لگا دی ہے۔ یہ میرا تحفہ ہے اپنی جگر گوشہ کے لئے۔ میں باقاعدہ پٹواری سے یہ کاغذات بنوا کر لایا ہوں تاکہ تم اعتبار کر سکو۔"

"بیٹی آپ کی ہے۔ تحفہ بھی آپ کا ہے۔ میں اعتبار کروں یا نہ کروں...... میرا کیا واسطہ......؟ بہرحال تسمیہ کی طرف سے میں تھینک یو کہتی ہوں مگر آپ کو بھی تو پیسوں کی ضرورت تھی......؟ فی الحال یہی زمین بیچ کر کاروبار شروع کر لیتے...... بعد میں......"

"خاموش رہو......!"

وہ غصے سے بولا۔

"تم اپنے باپ کا بخشا ہوا گھر بیچنا نہیں چاہتیں اور میں اپنے باپ کی وراثت بیچ دوں......؟ اب جو میں نے دستور کے مطابق اپنی بیٹی کے نام لگا دی ہے۔ ہم لوگ دیہات کے ضرور ہیں مگر جو کچھ اپنی بیٹی کو دے دیں، واپس لیتے ہیں نہ بوقت ضرورت بیچتے ہیں۔"

تسمیہ خاموش ہوگئی۔ خاموش ہی نہیں، مسلسل سوچتی رہی کہ اس نے مدہوش صاحب کو غلط سمجھا اور خواہ مخواہ شک کیا۔

ان کے درمیان ایک سرد سا تناؤ آگیا۔

اس مرتبہ مدہوش صاحب ایک ماہ پاکستان میں رہے۔ مگر انہوں نے پیسوں کی کوئی بات نہیں کی اور لندن واپس چلے گئے۔

پھر چھ ماہ کے بعد آئے۔ تسمیہ نے شکوہ کیا تو وہ بولے۔

"پاکستان میں رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ یہاں سے اخبار نکال لوں اور کوئی کام مجھے آتا نہیں۔ اخباری تنخواہ سے میرا گزارہ ہوتا نہیں۔ پیسے مل جاتے تو میں نئی شروعات میں پڑ جاتا۔"

بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد تسمیہ نے بالآخر اپنے آپ فیصلہ کر لیا اور مدہوش صاحب کو بتا دیا کہ سرِدست وہ انہیں پچیس لاکھ روپے کا چیک دے سکتی ہے۔ ابو جی کا مکان اس نے کرایے پر دے رکھا تھا اور اب اس کا کرایہ فکسڈ اماؤنٹ میں جمع ہو رہا تھا جو اتنا ہی بنتا تھا۔

وہ یکایک پہلے والے مدہوش صاحب بن گئے۔ ہنسنا ہنسانا، موج میلہ کرنا، بچے کے ساتھ چہلیں کرنا، فون پر گاہے گاہے سالیوں کے ساتھ ہنسی

مذاق کرتا۔ زندگی میں پھر وہی جیتے جاگتے پُر بہار دن لوٹ آئے۔

اس بار وہ تسیمہ کے پاس چار ماہ رہ کر گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اب کچھ عرصہ وہاں رہ کر وہ اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ نئے اخبار کی کاغذی کارروائی پر کام کریں گے۔ جبکہ نام کے لئے یہاں پر عرضی دے کر جا رہے ہیں۔

ان کے جانے کے بعد تسیمہ کی طبیعت پھر گری گری رہنے لگی۔ اس نے اپنی ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے مختلف ٹیسٹ کروانے کے بعد اسے حمل کی نوید دی۔ رات کو تسیمہ نے فون پر ملیحہ کو بتایا اور یہ بھی کہا کہ ابھی تسمیہ سات ماہ کی ہے اور دوسرا بچہ کیسے سنبھالا جائے گا......؟

"اب بتاؤ میں کیا کروں......؟"

ملیحہ نے سیانی ماں کی طرح مشورہ دیا کہ

"آپا......! آپ کی لیٹ میرج ہوئی ہے۔ ایسے میں بچے جلدی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ ورنہ یہ بھی ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ آخر دو تین بچوں کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ لڑکی ہو جائے تو لڑکے کی تمنا رہتی ہے۔ ممکن ہے اب کے آپ کا بیٹا ہو جائے۔ یوں بھی اکلوتا بچہ یا بچی گھر میں تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو اباڑشن کرانے سے کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور اتنا وقفہ بھی نہ دیں کہ دوسرا بچہ نہ ہو سکے۔ اب اس تکلیف کو برداشت ہی کر لیں تو بہتر ہے۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ ملیحہ نے سب ٹھیک کہا تھا۔

اس نے یہ سارے مرحلے برداشت کر لئے۔ کیونکہ اسے بھی بیٹے کی

تمنا تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ بیٹا کیا ہوتا ہے......؟ کیسا ہوتا ہے......؟ اور کیسی خوشی عطا کرتا ہے......؟ تسیمہ ساری زندگی ماں باپ کا بوجھ اُٹھاتی رہی۔ لڑکا شاید سارے بوجھ اُٹھانے کے لئے ہوتا ہے۔ اسی لئے والدین لڑکے کی تمنا دل سے کرتے ہیں۔

اس بار اللہ نے کرم کر دیا اور واقعی اس کا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اس نے تابش رکھا۔ ابو جی کو تابش نام بہت پسند تھا۔ ہمیشہ کہتے اگر میرا بیٹا پیدا ہوتا تو میں اس کا نام تابش رکھ دیتا۔

دو بچوں نے تسیمہ کو ایک معتبر اور معتمد عورت بنا دیا۔ اس کی زندگی کی تکمیل ہوگئی۔ اس نے ایک انڈونیشی آیا رکھ لی تھی۔ جو ہمہ وقت بچوں کا دھیان رکھتی تھی۔

مدہوش صاحب لندن سے فون کر کے بچوں کا حال پوچھ لیتے تھے اور بقایا پچیس لاکھ کا تقاضہ بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ اگر باقی رقم نہ دی گئی تو پہلی بھی غرق ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے کچھ گھر کے کرایے میں ایڈوانس لیا۔ کچھ تنخواہیں ایڈوانس لیں۔ ادھر ادھر سے کھینچ تان کے باقی کے پچیس لاکھ بھی انہیں روانہ کر دیئے۔ اس کے بعد مدہوش صاحب کا گھر میں آنا جانا لگا رہا۔

مگر اس کام کے متعلق انہوں نے کبھی تسلی بخش جواب نہیں دیا جس کے لئے انہوں نے تسیمہ سے پچاس لاکھ روپے لئے تھے۔

جب بھی وہ پوچھتی، یہی کہتے۔

"اتنی معمولی رقم دے کر مری جا رہی ہو۔ میں اپنی طرف سے پورا

شیئر ڈالوں گا تو اخبار نکل سکے گا۔ رقم جمع کر رہا ہوں۔ اسی لئے آیا ہوں۔ بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ اخبار نہ نکال سکا تو تمہاری رقم واپس کر دوں گا۔"

پھر کچھ عرصہ بعد ان کا یہ وطیرہ بن گیا کہ ایک دن آجاتے...... اور پھر اچانک بن بتائے چلے جاتے۔

کبھی آجاتے تو ہفتوں، مہینوں ٹکے رہتے۔ ان کے دوستوں کا تانتا بندھا رہتا۔ سارا دن چائے اور کھانے کے آرڈر آتے رہتے۔ نوکروں پر ناحق چلاتے رہتے اور تو اور رات کو شراب و ناب کی محفلیں بھی سجنے لگی تھیں۔ ان کے بہت سے ملکی اور غیر ملکی دوست گیسٹ روم میں قیام کرتے۔ نہ ان کا کسی سے تعارف کراتے۔ وقت بے وقت نوکروں کو جگا کر احکامات جاری کر دیتے۔ پورے گھر کا ڈسپلن انہوں نے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

تسمیہ اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہتی۔ بچوں کے ساتھ چڑچڑاتی رہتی۔ کالج میں بھی اس کا بلڈ پریشر ہائی رہتا۔ مگر ان سب مصیبتوں کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ اب کے وہ سارے گھر کو تہس نہس کر کے گئے تو تسمیہ نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ اس کے سر میں چکر آنے لگے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ حمل سے ہے۔

"حمل......؟ نہیں نہیں...... اب نہیں......"

وہ پریشان ہوگئی۔

"ان حالات میں نہیں......!"

تسمیہ پانچ سال کی تھی۔ تابش چار سال کا تھا۔ اور پھر کس قدر مشکل ہوگیا تھا، اس شخص کو اپنے بیڈ روم میں آنے سے روکنا۔ جب دل چاہتا نشے

میں دھت اندر آجاتا۔

اگر وہ گریز کرتی...... صبح کی کسی ضروری میٹنگ کا عذر دیتی...... یا دن بھر کی تھکاوٹ کا ذکر کر کے معذرت کرتی تو وہ کھلم کھلا الزام تراشی پر اُتر آتے اور کہتے۔

"کیوں......؟ کیا مجھ سے دل اُکتا گیا ہے......؟ سارا دن جو یاروں کے ساتھ گزارتی ہو...... تو کیا اپنی ضرورت بھی پوری کر لیتی ہو......؟"

"خدا کا خوف کریں......!"

وہ کہتی۔

"وہ سب میرے کولیگ ہیں۔ بھائیوں اور بیٹوں کی طرح۔"

"تو پھر تم اپنی ارج (Urge) کیسے پوری کرتی ہو......؟"

"ارج...... خواہش...... جبلت......"

وہ اپنے وجود سے ہی بے زار ہوگئی تھی۔ اس بے زاری کے عالم میں وہ شرعی حکم سمجھ کر ان کو قریب آنے دیتی تھی۔

یہ حمل ٹھہر گیا تھا۔ اب عمر کا تقاضا بھی نہیں تھا اور حالات کا بھی نہیں تھا۔ مگر یہ تو اللہ کی مرضی ہے جب دینے پہ آئے دے دے۔

اس نے اپنی ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ جس نے صاف کہہ دیا اس عمر میں اسقاط کرانا درست نہیں ہوتا۔ آپ کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور بچہ بھی ذہنی طور پر مفلوج ہو سکتا ہے۔

رات کو اس نے مدیحہ سے بات کی۔ پھر ملیحہ سے بھی مشورہ لیا۔

دونوں نے ابارشن کی مخالفت کی جبکہ تین ماہ گزر چکے تھے۔ دونوں

نے ڈرایا کہ اس میں جان کے جانے کا خطرہ ہے۔ تو یہ دو چھوٹے چھوٹے بچے کون سنبھالے گا۔

مدیحہ اس کو ذہنی طور پر پریشان دیکھ کر کچھ دنوں کے لئے اس کے پاس آ گئی۔ بچوں کو سنبھال لیا۔ گھر بھر کو ڈسپلن میں کر دیا۔

''آپا......! بھائی جان کو اطلاع دی ہے......؟''

ایک دن مدیحہ نے پوچھا۔

''کہاں پر اطلاع دوں......؟ وہ کوئی اپنا ٹھکانہ بتا کر جاتے ہیں......؟''

پھر یوں ہوا کہ ایک دن مدہوش صاحب کا امریکہ سے فون آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اخبار کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے یہاں اپنے ایک دوست کے پاس آ گیا ہوں۔ دو چار باتوں کے بعد تسبیحہ بولی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔''

''میں تو آ گیا ہوں۔''

وہ جھٹ بولے۔

''اب طبیعت کیوں خراب رہتی ہے......؟''

''مجھے...... میں...... پھر Pregnant ہو گئی ہوں۔''

وہ ہکلاتے ہوئے کہہ سکی۔

''کس کا ہے بائی داوے......؟''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ......؟''

وہ چیخی۔

''بھئی......! مجھے آئے ہوئے بھی کتنے دن ہو گئے ہیں۔''

''اور میرا بھی تو تیسرا مہینہ جا رہا ہے۔''

''اچھا......! اب صفائیاں پیش نہ کرو۔ بھگتو جس کا بھی ہے۔''

فون رکھ کے تسبیحہ کتنی دیر تک روتی رہی۔

مدیحہ تسلی دینے آئی تو وہ پھٹ پڑی۔

''یہ ہے شادی جس کے لئے تم لوگ مجھے بار بار مجبور کر رہے تھے۔ اکیلی تھی تو خوش تھی۔ اب تین بچوں کے ساتھ کس قدر مجبور کر دی گئی ہوں۔''

''آپا......! اپنے آپ کو سنبھالو۔ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ چلو اتنا تو ہوا کہ آپ صاحب اولاد ہو گئیں۔ کیا یہ خوشی کم ہے۔ زندگی یوں بھی گزر سکتی ہے۔''

گرمیوں کی چھٹیوں میں مدیحہ اسے اپنے ساتھ قطر لے گئی۔

وہیں اس کا چھوٹا بیٹا پیدا ہوا۔ جو ہو بہو ابو جی کی شکل تھا۔ شاید ان دنوں وہ ابو جی کو بہت یاد کیا کرتی تھی۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی۔

''یہ میرے درد کا درماں ہو گا اور پیار سے اسے درمان ہی بلانے لگی۔ ویسے تسبیحہ نے اس کا نام ابو جی کے نام پر توکل حسین ربانی رکھ دیا تھا اور دل میں فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ ابو جی کی تمنا کے مطابق اسے ڈاکٹر ہی بنائے گی۔

ان دنوں ملیحہ کا شوہر پاکستان گیا ہوا تھا۔ اس لئے ملیحہ بھی بچوں کو لے کر ان دونوں بہنوں کے پاس قطر آ گئی تھی۔

تینوں بہنیں ایک عرصے کے بعد مل کر بیٹھیں تو جنم جنم کے بوجھ ہٹانے کا سبب بن گیا۔ ذہنی بوجھ جو وہ لئے پھرتی تھیں۔

ملیحہ نے اپنے شوہر مشہود کو فون کر کے مدہوش صاحب کے کچھ رابطے دیئے اور کہا کہ ان کے بارے میں پتہ کر کے آئے۔

اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر کھوج نکال لیا تھا اور انہیں ای میل پر بتا بھی دیا تھا۔

عبدالکریم مدہوش کی پہلی بیوی اس کے آبائی گاؤں میں موجود تھی۔ جس میں سے اس کے پانچ بچے تھے۔ دو سال پہلے اس کی دو بیٹیوں کی شادی ہوئی تھی اور وہ لندن سے پچاس لاکھ روپے کما کر لایا تھا۔ اس نے اپنے رشتے داروں میں اپنی بیٹیوں کی شادی دھوم دھام سے کر دی تھی۔

یہ کہ کوئی فراڈ کر کے وہ لندن سے بھاگا تھا۔ اخبار والوں نے اسے نکال دیا تھا۔ شہر میں اس کے رابطے عزت دار لوگوں کے ساتھ نہیں تھے۔

سیاسی بلیک میلنگ کے لئے اسے بارسوخ لوگ استعمال کرتے تھے۔

اسی ضمن میں اب وہ امریکہ گیا ہوا تھا۔

تینوں بہنیں دنگ رہ گئیں۔

''اس سے چھٹکارا پالو۔''

مدیحہ بولی۔

''خطرناک آدمی ہے۔ بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہ اٹھانا۔ اُلٹی آنتیں گلے میں پڑ سکتی ہیں۔''

ملیحہ ہمیشہ پتے کی بات کہتی تھی۔

''پھر کیا کروں......؟ میرا تو ایک شریفانہ کیریئر بھی ہے۔''

''آپا......! خاموش رہو۔ ابھی دیکھو۔ اس کی اصلیت اس پر ظاہر مت کرنا۔ ایسے آدمی کو نہ بچوں کی پرواہ ہوتی ہے نہ بیوی کے کیریئر کی۔ بہت سوچ سمجھ کر ہر قدم اُٹھانا پڑے گا۔''

تینوں اس بات پر متفق ہوگئیں۔

پھر تینوں کے باہم مشورے سے یہ طے پایا کہ تسمیہ اور تابش کو قطر ہی میں اس امریکن سکول میں داخل کر دیا جائے جس میں ملیحہ کے بچے پڑھتے ہیں۔ دونوں بچے خالہ کے پاس ہی رہیں گے۔ گھر کے پراگندہ ماحول کا ان کی تربیت پر اثر بھی نہیں پڑے گا۔

درمان کے لئے انڈونیشی آیا اپنے پاس رکھ لی۔

بادی النظر میں وہ کالج کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ مگر اپنے وجود کو ٹوٹا پھوٹا اور اپنے ذہن کو منتشر منتشر محسوس کرتی رہتی۔

ایک خوف تھا جو ہمہ وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتا۔ جانے اگلے پل کیا ہو جائے......؟ اگلے مہینے کیا ہونا تھا......؟

عبدالکریم مدہوش صاحب اپنے جملہ ساز و سامان کے ساتھ اس کے گھر میں آن براجمان ہوئے۔

اور درمان کو دیکھ کر بولے۔

''یہ ہے وہ پلّہ جو میرے بعد پیدا ہوا ہے......؟''

''اگر آپ اسے پلّہ ہی سمجھ رہے ہیں تو آپ کا ہی ہے۔''

اس کے بعد گھر میں لڑائیوں اور بدمزگیوں کا ایک جھرنا سا کھل گیا۔

ایک دن جذباتی کشمکش کے موڑ پر تسمیہ نے اس کو اس کی اوقات صاف صاف بتا دی کہ وہ کون ہے.....؟ اور کیا کرتا رہا ہے.....؟ اور اب تک محض لوگوں کو بلیک میل کرنا ہی اس کا پیشہ رہا ہے۔

وہ بھی ڈھٹائی پر اُتر آیا۔ اکڑ کر بولا۔

"میں تمہارا شرعی شوہر ہوں اور تمہارے اوپر شرعی استحقاق رکھتا ہوں۔ نہ تم مجھے گھر سے نکال سکتی ہو اور نہ میں تمہیں کبھی طلاق دوں گا۔ اگر بہت تنگ کرو گی تو بچے بھی چھین کر لے جاؤں گا اور تمہیں اسی طرح اُلٹا لٹکائے رکھوں گا۔"

تسمیہ جانتی تھی کہ وہ ایسا کرسکتا ہے۔ وہ بدی کی کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ مجبوراً خاموشی سادھ لی۔

اگلے سات سال تسمیہ نے اس طرح گزارے جس طرح کوئی جہنم کے اندر رہ کر گزارتا ہے۔

اس نے تسمیہ کی زندگی اجیرن کرنے کے لئے اس کے انتظامی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ طلباء اور طالبات کو داخلہ دلوانے کے پیسے وصول کرنے لگا۔ یہی نہیں تسمیہ کے مرد کولیگز سے پیسے اُدھار لے کر آجاتا اور تسمیہ سے تقاضا کرتا کہ وہ یہ خطیر رقم ادا کرے۔

تسمیہ اور تابش چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کو طرح طرح سے اذیتیں دیتا۔ کبھی کبھی ان کو کھیلتے دیکھ کر غصے میں آجاتا اور اندر بلا کر ساری رات مرغا بنائے رکھتا۔ معصوم بچے کھڑے کھڑے بے ہوش ہو جاتے مگر اسے ان پر ترس نہ آتا۔

غصے کے وقت جو چیز اس کے ہاتھ میں آتی، بچوں کے منہ پر دے مارتا۔ ایک بار اس نے روتے ہوئے ورمان کو اُٹھا کر فرش پر دے مارا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ چار ٹانکے لگوانے پڑے تھے۔

پھر کسی آئے گئے کا لحاظ کئے بغیر اونچی اونچی آواز میں نوکروں کو فحش گالیاں دیتا رہتا۔

کالج کی لیکچرار راستے میں مل جاتیں۔ تو ان سے بھی فحش اور ننگے مذاق کرنے لگتا۔

جب تسمیہ سرزنش کرتی تو صاف کہتا۔

تم بھی کنجری ہو۔ گشتی ہو۔ حرام زادی ہو۔ سب باہر نکل کر کام کرنے والی عورتیں آوارہ اور بدکردار ہوتی ہیں۔ اپنے یاروں سے ملنے کے لئے نوکریاں کر لیتی ہیں۔"

کبھی کبھی وہ ابو جی کو تصویر کے آگے بیٹھ کر بہت روتی بے حد روتی۔ اور کہتی۔

"ابو جی.....! یہ شادی ہوتی ہے.....؟ اس قسم کی شادی کے لئے آپ مجھے مجبور کیا کرتے تھے.....؟ ایسی زندگی کی دُعا دی تھی آپ نے مجھے.....؟ میں آپ کی خواہش کے آگے مجبور سی کیوں ہوگئی.....؟ یہ آدمی میرا مقدر کیوں بن گیا.....؟ میرا قصور تو بتائیں ابو جی.....!"

بچے چھٹیوں میں گھر آتے تو سہمے سہمے رہتے۔ مدہوش صاحب نے باقاعدہ گیسٹ روم پر قبضہ کر رکھا تھا۔ وہیں اپنے دوستوں کے ساتھ محفلیں سجائے رکھتے۔ شراب کھلے عام پی جاتی۔ غل غپاڑہ بھی کیا جاتا۔

کئی بار تسمیہ نے منت کی کہ بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ اس کے سامنے شراب پی کر بدکلامی نہ کیا کریں۔ مگر وہ جواب میں کہتے۔

”کتیا......! آوارہ عورت......! خاموش رہ...... تیری جرأت کہ مجھے منع کرے۔ مجھے معلوم ہے تو کس طرح پرنسپل بنی پھرتی ہے اور شہر میں تیرے کتنے عاشق ہیں...... ورنہ اس عمر میں اتنی ترقیاں کیسے ملتی ہیں......؟“

ایجوکشن ڈیپارٹمنٹ کا کوئی بھی سرکاری افسر اس سے ملنے آجاتا یا کسی میٹنگ میں شرکت کا نوٹس آجاتا تو وہ فوراً کہہ دیتے۔

”اس کے ساتھ تیرے ناجائز مراسم ہیں۔ یہ ضرور تیرا یار ہوگا۔“

کبھی کبھی چھٹی کے وقت کالی عینک لگا کے گیٹ پر کھڑے ہو جاتے اور نوجوان لڑکیوں کو تانکا کرتے۔ سب جانتے تھے کہ یہ پرنسپل صاحب کے شوہر ہیں۔ اسی واسطے خاموش رہتے تھے۔

آئے دن مختلف دُکانوں سے اس کے نام کے بل آجاتے۔ جہاں سے وہ ضرورت کا سامان یا ملبوسات خرید لیتے۔

تسمیہ آرام سے بل ادا کر دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ آزار پہنچانے کے یہ ان کے اپنے ہتھ کنڈے ہیں۔

وہ سوچ سوچ کر بیمار رہنے لگی تھی۔ بے زار رہنے لگی تھی۔

کسی وقت بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ نوکری چھوڑ دے اور کہیں روپوش ہو جائے۔ جہاں یہ سب کچھ نہ ہو۔

”مگر کہاں جائے......؟“

سوچ سوچ کر سر میں درد رہنے لگا تھا۔

”بچوں کو کس طرح پالے......؟“

تسمیہ نے میٹرک کر لیا تھا۔ وہ اب کالج جانے والی تھی۔

تابش اے لیول کر رہا تھا۔

درمان بھی سکول میں داخل ہو گیا تھا۔

بچوں کی تعلیم کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ مدہوش صاحب نے تو اسے کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیا تھا۔ اب اگر یکایک نوکری چھوڑ دے تو اخراجات کہاں سے آئیں گے......؟ کون بوجھ اُٹھائے گا......؟

❀ ❀ ❀

تسمیہ اور تابش گھر کے حالات کو سمجھنے لگ گئے تھے۔

تسمیہ تو صاف کہتی تھی۔

''ماما......! تم ڈیڈی سے طلاق لے لو...... الگ ہو جاؤ ماما......''

تابش کہتا۔

''ماما......! اس شخص کے ساتھ رہنے میں آپ کی کیا مجبوری ہے......؟ جسے ڈیڈی کہنے کو بھی دل نہیں مانتا۔''

وہ کہتی۔

''بچو......! تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ ان مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''ماما......! صاف نظر آرہا ہے۔ تم کنوئیں میں اُلٹی لٹکی ہوئی ہو۔ اس طرح رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''بیٹا......! تمہیں کیا معلوم......؟ مائیں یہ زہر بچوں کے لئے کھاتی ہیں۔''

''مگر ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ماما......!''

تابش کہتا۔

''جب کوئی ایسا وقت آئے گا ہم تمہارا ساتھ دیں گے ماما......!''

اس بات پر وہ رونے لگتی۔

''ماما......!''

ایک دن چھوٹے درمان نے بڑی معصومیت سے آکر کہا۔

''آپ ڈیڈی کو کان سے پکڑ کے گھر سے نکال کیوں نہیں دیتیں......؟ وہ ہر وقت ہمیں مارتے رہتے ہیں۔ گالیاں دیتے رہتے ہیں۔''

''بیٹا......! ڈیڈی کو ایسا نہیں کہتے۔''

''کیوں نہیں کہتے......؟''

''ڈیڈی جو ہیں۔''

''تو وہ مجھے حرامی کیوں کہتے رہتے ہیں......؟''

''بس بیٹا......! تم ان کے سامنے نہ جایا کرو۔''

''ماما......! یہ گھر تو آپ کا ہے۔ پھر ڈیڈی ہمیں دھکے دے دے کر نکل جانے کو کیوں کہتے رہتے ہیں......؟''

''بیٹا......! دھکے دینے سے کوئی نکل نہیں جاتا۔ تم اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو۔ تمہیں ڈاکٹر بننا ہے۔''

''جی ماما......! جب سے آپ نے مجھے بتایا ہے کہ میرے نانا جان کی بڑی خواہش تھی کہ آپ ڈاکٹر بن جائیں، تب سے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ڈاکٹر ہی بنوں گا۔''

دن سلگ رہے تھے اور راتیں دہک رہی تھیں۔

وہ اپنی مشنری سرپٹ کے ساتھ کالج کے کاموں میں لگی رہتی تھی۔

ان کی کوششوں سے تہذیب کالج کی بڑی مشہوری ہوگئی تھی۔ یہ کوایجوکیشن کا

کالج تھا۔ اس کا سٹاف اعلیٰ تھا اور یہاں سٹوڈنٹ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی تھی اور کردار سازی بھی کی جاتی تھی۔

گریجوایشن کے بعد طلباء و طالبات جو پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے، اس میں ان کی راہنمائی بھی کی جاتی تھی۔

آئے دن سٹوڈنٹ کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ملک کے اندر بھی اور ملک سے باہر بھی۔ خصوصیت سے مڈل ایسٹ سے بہت سی لڑکیاں یہاں پڑھنے آتی تھیں اور ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ ان کے والدین بھی تسبیحہ سے ملنے آتے رہتے تھے اور ہمیشہ اطمینان کا اظہار کرتے تھے۔

اس لئے کالج کی توسیع کا ایک منصوبہ بنایا گیا۔

کالج کے اندر بڑے بڑے وسیع و عریض لان تھے۔ ایک طرف کالج کا سٹیڈیم تعمیر کرنے کا منصوبہ زیرِ غور تھا۔ دوسری جانب سائنس بلاک کے لئے دو منزلہ عمارت اور آڈیٹوریم تعمیر کرنے کا نقشہ منظور ہو کر آ گیا تھا۔

ماہرین تعمیرات اور انجینئرز سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ تسبیحہ کا اپنا بھی یہ خواب تھا اور وہ اس میں مگن ہو گئی تھی۔ اس کو گھر بار کا بالکل ہوش نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی بچوں کے واپس جانے کے بعد وہ چاہتی تھی، جتنا عرصہ گھر سے دُور رہے، بہتر ہوگا۔ وہ اپنی زندگی کا سارا وقت اب اس فلاحی کام میں ہی صرف کرنا چاہتی تھی۔ اس کی تجاویز مکمل ہونے کے بعد کالج کے مالکان بھی آ گئے تھے۔

بجٹ پر کام ہونے لگا۔ تخمینہ پچاس کروڑ کے لگ بھگ لگایا گیا۔ اس کے بعد مختلف کنسٹرکشن کمپنیوں سے ٹینڈر طلب کئے گئے۔

ایک کمپنی کے ٹینڈر کثرتِ رائے سے منظور ہو گئے۔ اگلے تین ماہ کے اندر کام شروع ہو گیا۔ سائٹ کی سپرویژن چار سینئر سٹاف ممبرز کے سپرد کی گئی۔ یوں تسبیحہ کی کوششیں بارآور ہوئیں اور اس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا۔

کنٹریکٹ کے مطابق اس عمارت کو ایک سال کے اندر مکمل ہونا تھا۔

یکا یک کالج کے اندر ایک نیا سیکنڈل سر اُٹھانے لگا۔

چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سرگوشیاں الزام بننے لگیں اور اخبارات کے رپورٹر بیچ میں کود پڑے۔

قصہ یوں ہوا کہ سروے کرنے والے سٹاف نے پہلے یہ اعتراض اُٹھایا کہ سائٹ پر ناقص میٹریل بھیجا جا رہا ہے۔ پھر اعتراض کیا کہ کام کی رفتار سست ہے اور جب کنسٹرکشن کمپنی کے مالک کو روبرو حاضر ہونے کا نوٹس دیا گیا تو وہ ملک سے باہر بھاگ گیا اور پیشگی وصول کی ہوئی رقم سات کروڑ بھی ساتھ لے گیا۔ یہ ایک ایٹم بم تھا جو تسبیحہ کے دماغ کے اوپر پھٹا کہ مدہوش صاحب نے کالج کے ہیڈ کلرک اور ایک جونیئر پروفیسر کی ملی بھگت سے پائیدار کنسٹرکشن کمپنی کے نام سے ایک کمپنی بنا لی تھی۔ تینوں حصہ دار بن گئے تھے اور ٹینڈر منظور کروانے میں بھی ان پروفیسر صاحب اور ہیڈ کلرک کا ہاتھ تھا۔ ورنہ ایک بالکل نئے نام کی کمپنی کو جس نے کہ پاکستان کے ازر کوئی کام نہ کیا ہو، یہ ٹھیکہ کیسے مل سکتا تھا......؟

جب بات کھلی تو مدہوش صاحب سارا سرمایہ لندن منتقل کر کے راتوں رات لندن بھاگ گئے تھے۔

اخبارات کو اور الیکٹرانک میڈیا کو ایک موضوع مل گیا۔

تسبیحہ ربانی کی ذات پر ہر جگہ کیچڑ اُچھالا جانے لگا۔ اس بات پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ بیوی کی بے خبری میں شوہر نے اتنا بڑا قدم اُٹھا لیا۔

مگر کالج کے سب قریبی لوگ جانتے تھے کہ تسبیحہ ان سب باتوں سے لاعلم تھی۔ کچھ لوگوں کو اس کے گھریلو حالات کا بھی علم تھا۔

جب چاروں طرف سے لعنت ملامت ہونے لگی تو تسبیحہ کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ اسے ہسپتال داخل کرنا پڑا۔

رپورٹر وہاں بھی پہنچ جاتے اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگتے۔

جب اس سے اس کے شوہر کا لندن میں پتہ ٹھکانہ پوچھا جاتا تو وہ لاعلمی کا اظہار کر دیتی۔ اس پر اسے بھی بدعنوانی میں شامل سمجھ لیا جاتا کہ اپنے شوہر کو بچانے کے لئے اس نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے۔

بالآخر ہیڈ کلرک کو گرفتار کر لیا گیا۔ چند دن جیل کی سلاخوں کے اندر اذیت سہہ کر اس نے سچ اُگل دیا کہ مدہوش صاحب نے اپنی بیوی سے چوری یہ منصوبہ بنایا تھا اور ہم سے قسمیں لی تھیں کہ ان کی بیوی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ورنہ وہ ٹھیکے میں حائل ہو جائے گی۔

دوسرے وہ کہتے تھے کہ انہیں کنسٹرکشن کا بہت تجربہ ہے اور لندن میں وہ یہی کام کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سے اس ضمن میں لاکھوں روپے قرض بھی لئے تھے۔ منافع پانے کے لالچ میں ہم ان کے ساتھ مل گئے تھے۔

کالج کے اندر جو لوگ پرنسپل کی سیٹ حاصل کرنے کے دیر سے تمنائی تھے، وہ تقاضا کرنے لگے کہ تسبیحہ کو Suspend کر دیا جائے اور اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ مگر مالکان کو چونکہ اس کی شریف النفسی اور بے گناہی کا یقین تھا، اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ ازخود مستعفی ہو جائے۔

اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ جس کیریئر کو اس نے اپنی ساری رعنائی اور توانائی دے دی تھی، جو اس کا تابناک ماضی تھا، اسی کو ایک شرمناک احساس کے ساتھ چھوڑنا پڑا۔

استعفیٰ دینے کے بعد مدیحہ آئی اور اسے اپنے ساتھ قطر لے گئی۔ اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے پاکستان میں تنہا چھوڑ دیا جاتا۔ البتہ درمان کو میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں داخل کرا دیا گیا۔

❀ ❀ ❀

دو سال تسمیہ قطر میں اپنی بہن کے پاس رہی۔ جب اس کی ذہنی حالت ٹھیک ہوگئی تو اس نے ایک غیر ملکی کمپنی میں دو سال کے کنٹریکٹ پر ملازمت کر لی۔ کیونکہ فارغ بیٹھ کر وہ اور بھی پریشان ہو جاتی تھی۔

اسی اثناء میں تسمیہ نے گریجوایشن کر لیا۔ اس کی کلاس میں مراکش کا ایک مسلمان لڑکا پڑھتا تھا۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ تسمیہ نے کوئی ضد نہیں کی۔ سادگی سے شادی کر دی۔ وہ دونوں نئی زندگی کی شروعات کے لئے آسٹریلیا چلے گئے۔

تابش مزید تعلیم کے لئے جرمنی چلا گیا۔ اسے سکالرشپ کی آفر آئی تھی۔ اگلے سال اس کو جاب مل گیا اور اس نے اپنی پسند سے اور ماں کی اجازت سے ایک جرمن لڑکی جولیا سے شادی کر لی۔

اب تسمیہ کے ذہن سے بہت سے بوجھ اُتر گئے تھے اور ذہن کے زخم بھی بھر گئے تھے۔ اس لئے اس نے پاکستان واپس جانے کی ضد کی۔

بہنوں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانی۔ وہ کہتی تھی۔

"میں پاکستان کے علاوہ کہیں نہیں رہ سکتی۔"

پھر اسے ہر وقت درمان کا خیال رہتا تھا۔ گو وہ چھٹیوں میں آجاتا تھا

مگر وہ کہتی۔

"اب میں سارا وقت اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ جسے باپ کی طرف سے نفرت ہی ملی تھی۔"

وہ پاکستان آگئی۔ ابو جی والا گھر خالی کرا کے وہاں رہائش اختیار کی۔

درمان ہوسٹل سے اس کے پاس آگیا تھا۔

رات کو آکر وہ ماما کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتا تو وہ اسے بتاتی۔

"وہ جو گیراج کے ساتھ انیکسی ہے نا......! جسے میں نے اب کرائے پر چڑھا دیا ہے، یہ ابو جی نے اس لئے بنوائی تھی کہ جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو یہاں پریکٹس کروں گی اور باہر میرے نام کا بورڈ آویزاں ہوگا۔

ڈاکٹر تسمیہ ربانی......!"

تب درمان جذباتی ہو کر کہتا۔

"ماما......! میں نانا جان کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا، انشاء اللہ......! ایک دن یہاں توکل حسین ربانی جونیئر کا بورڈ لگا ہوگا۔"

"بیٹا......!"

ایک دن تسمیہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں نے تمہارے نام کے ساتھ تمہارے ڈیڈی کا نام نہیں لگایا۔ تمہیں برا تو نہیں لگا......؟"

"نہیں ماما......! اگر آپ نے ڈیڈی کا نام لگا بھی دیا ہوتا تب بھی میں اپنے آپ کو ڈاکٹر ربانی ہی کہلاتا۔ جس باپ نے مجھے قبول نہیں کیا، ہمیشہ گالیاں دیں اور دھکے مارے...... میں اس کا نام کیوں اپنے نام کے ساتھ

لگاؤں گا......؟''

پاکستان میں آکر تسمیہ نے اپنی زندگی کی دوبارہ شروعات کی۔ نوکری سے اب وہ بے زار ہوگئی تھی۔ اس نے نصاب کی کتابیں معاوضے کے عوض لکھنے کی آفر قبول کر لی۔ کئی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ تب اس کے پاس اتنا کام اکٹھا ہوگیا کہ اسے سر اُٹھانے کی فرصت نہ رہی۔ کام کرنا اسے پسند تھا۔

حسنِ اتفاق سے اسے پرانے کالج یعنی تہذیب کالج سے دوبارہ پرنسپل شپ کی آفر ہوئی۔ کیونکہ اس کے جانے کے بعد کالج کا وہ معیار نہیں رہا تھا اور اس بات کا احساس مالکان کو بھی ہوگیا تھا۔

مگر اس نے یہ آفر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ رسوائی کی ڈھول اس کے لاشعور سے محو نہیں ہوئی تھی۔ وہ پرانی ڈگر پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ ہر پرانا درد، پرانا واقعہ اور پرانی باتیں وہ گرد کی طرح جھاڑ دینا چاہتی تھی۔

ایک دن انٹرنیٹ پر اس کے لئے ایک پیغام آگیا۔

''تسمیہ پلیز......! میری پوری بات ضرور سننا۔ میں تمہارا گناہگار ہوں۔ میں نے اپنی اذیت پرستی کی وجہ سے تمہیں جان بوجھ کر اذیتیں دیں۔ کیونکہ میں بچپن سے احساسِ کم تری کا مریض تھا۔ مجھے بچپن میں پاگل پن کے دورے پڑتے تھے۔ ان دنوں کچھ عرصہ کے لئے مجھے مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرا دیا جاتا تھا۔

ایک دن میں ہاسپٹل سے بھاگ گیا تھا۔ رُل کھل کے میں نے تعلیم مکمل کی۔ والدین نے میری شادی کر دی کہ شاید میں ٹھیک ہو جاؤں۔

میرے بچے بھی ہوئے۔ جب میں ذرا ٹھیک ہوا تو بیوی کے زیور چرا کر بیچے اور لندن چلا گیا۔ وہاں ایک یورپین عورت سے افیئر چلایا اور شادی کی۔ وہ تیسرے مہینے مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر مجھے تم نظر آگئیں۔ تم اتنی معصوم اور مصفا تھیں کہ مجھے یقین ہوگیا کہ تم میرے لئے ترقی کی سیڑھی بن سکتی ہو۔ مگر تمہارے اندر کی مشنری اور سچی عورت نے مجھے سیخ پا کر دیا۔

میں کسی ہمدردانہ جذبے کی تمنا میں یہ سب نہیں لکھ رہا۔ جو کچھ بھی میں تمہارے ساتھ کرتا رہا، اراد تاً تھا۔ تمہارے کیریئر سے مجھے بیر ہوگیا تھا اور وہ آخری حرکت...... سات کروڑ روپے لے کر فرار ہونے والی...... اس لئے کی کہ لندن میں میں نے بہت سے لوگوں سے قرضے لے رکھے تھے اور وہ میرا وارنٹ گرفتاری لئے پھرتے تھے۔ میرا خیال تھا ان کے قرضے ادا کر کے کچھ پیسے بچ جائیں گے جن سے میں کوئی نیا کاروبار شروع کر لوں گا۔

مگر میں یہ بھول گیا تھا کہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ انسان کیسی بھی پلاننگ کرے، اس نظام سے نہیں بچ سکتا۔

چھ ماہ پہلے میں ہسپتال میں داخل ہوا اور ٹیسٹوں سے معلوم ہوا کہ مجھے بلڈ کینسر ہے اور وہ بھی آخری سٹیج پر۔ میں ایک خیراتی ہسپتال میں پڑا ہوا ہوں۔ یہاں میرا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔

میں نے اپنی اولاد کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا کہ وہ میرے نام سے متنفر ہے۔

تسمیہ......! معافی ایک بہت چھوٹا لفظ ہے۔ مل جائے تو نجات کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ لفظ تمہاری پوری زندگی کی کلفتوں اور

صعوبتوں کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اس خط کو بس اعترافِ گناہ سمجھو۔

میں نے ہسپتال کے کاغذوں میں ورثاء کے خانے میں تمہارا نام اور پتہ لکھوا دیا ہے۔ کم از کم میرے مرنے کے بعد کسی کو تو دنیا میں اطلاع مل جائے۔

اور تم ہی وہ واحد ہستی ہو جو میرے لئے نجات اور مغفرت کی دُعا کرو گی۔

گناہ گار

عبدالکریم مدہوش

تسمیہ یہ تحریر پڑھ کے ہکا بکا سی بیٹھی تھی کہ درمان آ گیا۔

"ماما..... کیا بات ہے.....؟ پریشان لگ رہی ہو۔"

تسمیہ نے کمپیوٹر اس کے آگے کر دیا۔ اور بولی۔

"پڑھ لو.....!"

"اُف ماما.....!"

درمان پڑھنے کے بعد چلا اُٹھا۔

"ماما.....! یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ ماما..... یہ بھی اس کا کوئی حربہ ہے۔ ماما.....! یہ پھر تم سے پیسے بٹورنا چاہتا ہے۔ Be Careful Mama!"

رات تک اس نے اپنی بڑی بہن اور بھائی کو یہ خبر سنا دی۔ وہ بھی لائن پر آ گئے۔

تسمیہ نے کہا۔

"ماما.....! اللہ کے واسطے اب اس کے فریب میں نہ آنا۔ اس کی یہی سزا ہے۔ اسی طرح مر جائے۔"

تابش نے کہا۔

"ماما.....! تم نئے سرے سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ خبردار جو تم نے اسے معاف کیا۔"

مگر وہ تو جیسے گم سم سی ہو گئی تھی۔ اس نے کبھی اسے بددعا بھی نہیں دی تھی۔ کبھی نہیں کوسا تھا۔ بچوں کی دولت اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ بچے کلیتہً اس کے ہو گئے تو وہ شوہر کے بخشے ہوئے دُکھ بھول گئی۔ دونوں بچے روزانہ آن لائن اسے تاکید کیا کرتے اور خبردار بھی کرتے رہتے۔ کچھ دنوں کے بعد واقعی دو سطر کی خبر آ گئی۔

"عبدالکریم مدہوش ایک ماہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر چل بسا۔ اسے اس کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔"

اس نے محلے کی مسجد سے قاری صاحب بلوائے اور باقاعدہ اس کے سوئم کا ختم دلوا دیا گیا۔ جب قاری صاحب اور ان کے شاگرد پڑھ پڑھا کر چلے گئے تو وہ اس سفید بچھی ہوئی چادروں کے کنارے پر بیٹھی رو رہی تھی اور گٹھلیوں پر قل ہو اللہ پڑھ رہی تھی۔

درمان کالج سے آ گیا۔ آتے ہی پاس بیٹھ گیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر بولا۔

"ماما.....! آپ بھی کتنی عجیب ہیں۔ ایسے شوہر کے لئے رو رہی ہیں

جس نے دُکھ کے سوا آپ کو کبھی کچھ نہ دیا۔"

"پگلے......! میں اس لئے رو رہی ہوں کہ جب انسان جانتا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے۔ ہر شے ختم ہو جانے والی ہے تو پھر وہ یہ چند روزہ زندگی محبت میں کیوں نہیں گزار سکتا۔ یہ سارا وقت نفرت کرنے اور آزار پہنچانے میں کیوں گزارتا ہے......؟"

❀ ❀ ❀

کیسے میلے کچیلے اور بے رنگ سے دن گزر رہے تھے۔ وقت جیسے کسی اندھی گپھا میں جا کر خاموش ہو گیا تھا۔

تھکی تھکی تسبیحہ نے کتابوں کی دُنیا سے سر اُٹھایا۔ باہر فضا کو دیکھا۔ پھر آ کر کیلنڈر کو دیکھنے لگی۔

اس نے گزشتہ پانچ سالوں میں سینکڑوں نصاب کی کتابیں ترتیب دی تھیں۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے علاوہ سرکاری تعلیمی ادارے بھی اس سے رجوع کرتے تھے۔ اس نے ہر کلاس کے لئے انگریزی کا نصاب ترتیب دیا تھا۔ اس نے چونکہ اپنے تینوں بچوں کو ابتدائی تعلیم گھر پر دی تھی اور اسے کالج میں بھی پڑھانے کا تجربہ تھا، اس لئے اسے معلوم تھا کہ پہلے قاعدہ سے لے کر کتاب تک بچوں کو کیا پڑھانا چاہئے۔ اپنی علمی دیانت داری اور تجرباتی خلوص کے ساتھ اس نے پانچ سال تک یہ کام کیا تھا۔

آج اس کے آخری کنٹریکٹ کی تاریخ ختم ہو گئی تھی۔ وہ اپنا سارا کام مکمل کر چکی تھی۔ سچی بات ہے، وہ اس کام میں بہت تھک گئی تھی۔ اس حرف حرف آگہی کے کام نے اسے نچوڑ لیا تھا۔ دن رات کام میں ڈوبی رہتی۔ نہ کوئی تفریح نہ کہیں آنا جانا۔

کیلنڈر کو دیکھنے کے بعد وہ آ کر آئینے کے آگے کھڑی ہوگئی۔

"اُف......! سفید بال نکل آئے تھے۔ رنگ سانولا ہوگیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹ مٹیالے ہوگئے تھے۔ وزن بڑھ گیا تھا۔ جسم بے ڈول ہوگیا تھا۔ بڑھاپا کس طرح گھٹا باندھ کے آ رہا ہے۔"

اس نے سوچا۔

اب بیٹھنے والا کام نہیں کرنا چاہئے۔ زندگی میں کچھ ہلچل ہونی چاہئے۔ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے معمولات میں چستی نہیں رہتی۔ اس لئے اس نے نئے معاہدے کرنے سے احتراز کیا تھا۔

تھوڑا سا آرام کرنا چاہتی تھی۔ کام کی نوعیت بدلنا چاہتی تھی۔

پہلے تو اس نے اپنے ہی لان میں واک شروع کر دی اور ہر صبح اخبار کے اندر چھپنے والے اشتہارات دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

ایک روز صبح کا اخبار پڑھتے ہوئے تسیمہ چونک گئی۔ آدھے صفحے کا بڑا ہی دلچسپ اشتہار تھا۔ اس نے صفحہ پھیلا کر سامنے رکھ لیا اور بار بار اس اشتہار کو پڑھا۔

کسی امریکہ پلٹ شخص کی طرف سے یہ اشتہار تھا۔ وہ پاکستان کے اندر ایک انٹرنیشنل، جدید علوم، فنون سے آراستہ درس گاہ بنا رہا تھا۔ جس کے لئے اسے تجربہ کار ریٹائرڈ پرنسپلز اور پروفیسر صاحبان کی ضرورت تھی۔ جبکہ دوسرے لوگ ہمیشہ نوجوان تر و تازہ اور ٹیلنٹڈ نفری مانگتے ہیں۔ بڑی پُرکشش آفر تھی۔ تسیمہ نے انٹرویو کی تاریخ نوٹ کر لی اور اس کا دماغ جلدی جلدی کام کرنے لگا۔

انٹرویو میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ وہ اُٹھی اور اپنی وارڈروب کھول کر کھڑی ہوگئی۔ وہی پرانے فیشن کے کپڑے...... نہ باہر نکلی نہ نئے کپڑے سلوائے۔ گاڑی لے کر بازار نکل گئی۔ کچھ ساڑھیاں اور کچھ سوٹوں کا میٹریل خریدا۔ پرانے درزی کے پاس گئی۔ اسے سب کچھ سلنے کو دے دیا۔ صبح کی سیر باقاعدہ سے شروع کر دی۔ خوراک میں تبدیلی کی۔ ورزش کے لئے بھی وقت نکلنے لگا۔ بال باقاعدہ رنگوائے۔ وہ نئے سرے سے پھر ورکنگ وویمن لگنا چاہتی تھی۔ ایک نئی کروٹ لینا چاہتی تھی۔ یوں بھی جب زندگی میں انجماد پیدا ہونے لگے، اپنا طرزِ زندگی بدل لینا چاہئے۔ وہ اس نکتے کی قائل تھی۔

جس صبح وہ انٹرویو پر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی، درمان اچانک کمرے میں آ گیا۔

"ماما......! کیا بات ہے......؟ ارادے خطرناک لگتے ہیں۔ یہ سج دھج...... یہ خوشبو...... یہ ساڑھی۔"

"کمینے......!"

وہ اسے کنگھی سے مار کر بولی۔

"ایک انٹرویو کے لئے جانا ہے۔ گھر بیٹھ کر میں بالکل نکمی لگنے لگی تھی۔ اب چاہتی ہوں۔ کیریئر ویمن بن کے جاؤں۔"

"میں سمجھا...... شاید کوئی نیا پروپوزل آ گیا ہے......؟"

"بدتمیز......! یہ میری عمر ہے ایسی باتوں کی......؟ پتہ ہے 59 سال کی ہوگئی ہوں۔"

"ماما......! کسی کام کے لئے عمر مخصوص نہیں ہوتی۔ اصل چیز سوچنے کا

انداز ہوتا ہے۔''

''گدھے......! تو اتنا بڑا ہوگیا ہے کہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے......؟ چل بھاگ......!''

وہ باہر بھاگ گیا۔

تسبیحہ نے چابی اُٹھائی اور باہر آگئی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور سڑک پر آگئی۔ آج کافی عرصے کے بعد وہ اس پروفیشنل انداز سے باہر نکلی تھی۔ تھوڑی سی نروس بھی تھی اور اپنے آپ کو چست بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ ٹریفک بہت زیادہ حل رہا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر وقت کی پابندی کی بڑی قائل تھی۔ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ پانچ منٹ اوپر ہوگئے تھے۔ گاڑی پارک کر کے وہ عمارت کے اندر داخل ہوئی۔ چپڑاسی سے کمرہ پوچھا۔ اس نے اشارے سے بتا دیا۔ ذرا سا اندر داخل ہوئی تو ایک مستطیل سی میز کے گرد بہت سے خواتین و حضرات بیٹھے تھے۔

وہ جھجک کر باہر آگئی۔

''یہاں تو بہت سے لوگ بیٹھے ہیں بابا......!''

''جی......! یہیں پر انٹرویو ہو رہا ہے۔''

وہ اپنی C.V کی فائل اٹھائے اندر آگئی۔ تقریباً بیس پچیس لوگ میز کے گرد بیٹھے تھے۔ تین عورتیں بھی تھیں۔ ایک کرسی آخر میں خالی تھی۔ وہ لپک کر اندر آئی۔ سلام کیا اور اس خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ابھی بات نہ کر پائی تھی کہ سامنے والے کمرے سے ایک صاحب باہر آئے۔

سر پر سفید براق بالوں کا ٹوکرا سا...... سفید گلابی چمکتا ہوا رنگ......

بڑی بڑی روشن آنکھیں...... صحت مند اور جاذبِ نظر قد و قامت...... سوٹ بوٹ نکٹائی میں ملبوس...... میز کے دوسرے کنارے پر آکر کھڑے ہوگئے جہاں ایک قدرے بڑی کرسی پڑی ہوئی تھی۔

السلام علیکم کہا اور گھڑی دیکھی۔ پھر کہا۔

''میں چاہتا تھا سب مہمان پہنچ جائیں۔ پھر اندر آؤں۔ پانچ منٹ کی تاخیر ہوئی، معافی چاہتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے تسبیحہ کی طرف دیکھا۔ تسبیحہ نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ پانچ منٹ لیٹ وہ ہوئی تھی۔ جو ہمیشہ سے وقت کی پابند تھی۔

''میرا نام عطاز قادری ہے۔ پہلے آپ سب سے تعارف ہو جائے پھر اگلی بات کریں گے۔''

وہ خود ہر ایک اُمیدوار کے پاس آئے۔ ہر ایک سے ہاتھ ملایا۔ ہر ایک نے اپنا تعارف کرایا۔ ہر ایک سے انہوں نے C.V فائل خود پکڑ لی۔

تسبیحہ نے شرمندگی اور گھبراہٹ میں یہ نہیں دیکھا جو تین عورتیں وہاں موجود تھیں، انہوں نے ہاتھ ملایا کہ نہیں۔

مگر ان کے قریب آتے ہی وہ کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے ہاتھ ملا لیا۔ بہت نرم اور گرم تھا ان کا ہاتھ۔

تعارف کے بعد وہ آکر سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئے اور بڑی ہی شستہ اور گمبھیر آواز میں بولے۔

''پہلے تو میں آپ سب قابل قدر اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں

کہ آپ سب یہاں تشریف لائے۔ پھر یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ کوئی باقاعدہ انٹرویو نہیں ہے۔ کیونکہ جو لوگ اپنے پیشے میں کمال حاصل کر کے ریٹائر ہوتے ہیں، ان سے روزمرہ کے عامیانہ سوالات نہیں پوچھے جانے چاہئیں۔ آج ہم ایک قسم کے مباحثے کا آغاز کریں گے اور آپ خواتین و حضرات اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور تجاویز پیش کریں گے۔ جن کی روشنی میں ہم اپنا لائحہ عمل بنائیں گے۔

آج کا ہمارا سوال ہے۔

ہمارے ملک کے موجودہ نظامِ تعلیم میں کیا خامیاں ہیں جن کی وجہ سے ہم وہ نسل پیدا نہیں کر سکے جو اس ملک کی ضرورت تھی......؟

آپ سب چونکہ اپنی مدتِ ملازمت شعبۂ تدریس ہی میں گزار چکے ہیں، اس لئے اپنے تجربات کی بناء پر بحث کا آغاز کریں۔

وہ خود سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور اُمیدواروں کی فائلیں اپنے آگے رکھ لیں۔ گھر سے کوئی بھی اس بات کے لئے تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔ ہر کوئی اپنی ڈگریوں سے لدی ہوئی فائلیں اُٹھا کر لے آیا تھا۔

تاہم کلاک وائز انہوں نے بحث کا آغاز کر دیا۔

کسی نے مختصر بات کی۔

کوئی موضوع کے بخیے اُدھیڑنے لگا۔

کوئی موضوع کے اندر اُلجھ کر رہ گیا۔

کوئی شروع کر کے اتنی طوالت میں چلا گیا کہ اس سے بات سمیٹی نہ گئی۔

کسی نے مناسب بات کر دی۔

وہ خاموشی سے سنتے رہے اور ہر ایک کی فائل کھول کر اس پر نوٹس بناتے رہے۔

چونکہ تسبیحہ سب سے آخر میں پہنچی تھی اور سب سے آخری کرسی پر بیٹھی تھی اس لئے اس کی باری سب سے آخر میں آئی۔ وہ سب کی تجاویز بھی سن چکی تھی۔ اسے اپنے خیالات ترتیب دینے کا موقع مل گیا تھا۔ اس لئے بڑے سکون سے گویا ہوئی۔

''سر......! پہلے تو معذرت چاہتی ہوں پانچ منٹ لیٹ اس لئے ہوئی کہ اتنے ٹریفک میں موٹر چلانے کی عادت نہیں رہی۔''

وہ زیرِ لب مسکرائے اور اس کی فائل کھول لی۔

''سر......! ہمارے اکابرین سے ایک بڑی غلطی ہوئی۔ پہلی بات یوں شروع کروں گی کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد انہیں ایک مربوط نصابِ تعلیم ترتیب دینا چاہئے تھا جو پاکستان کے سارے صوبوں کے لئے یکساں ہوتا۔ کم از کم میٹرک تک نصابِ تعلیم ایک جیسا ہوتا۔ میڈیم آف انسٹرکشن اُردو ہی ہوتا۔ لیکن انگریزی پہلی جماعت سے پڑھائی جاتی۔ تاکہ جن بچوں نے سائنس یا میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنی ہے، ان کے لئے آسانی ہو جاتی۔ اُردو اور انگریزی کو لازمی قرار دیا۔ ہر صوبے میں اس صوبے کی زبان ایک مضمون کے طور پر رکھی جاتی۔

دوسری بات سر......!

نظامِ تعلیم، نصابِ تعلیم اور ذریعۂ تعلیم پر مستقل کام نہ ہونے کی وجہ

سے پاکستان کے اندر طبقاتی تعلیم کا رواج زور پکڑنے لگا۔

طبقاتی تعلیم سے میری مراد ہے کہ سرکاری سکول۔ انگریزی میڈیم سکول، اولیول سکول، اے لیول سکول، وغیرہ وغیرہ۔

صاحب حیثیت لوگ انگریزی پرائیویٹ سکولوں کی طرف آگئے اور سرکاری سکولوں کا معیار بتدریج گرنے لگا۔

اس پر نصاب کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ انگلش میڈیم نصاب علیحدہ ہے۔ اُردو میڈیم نصاب علیحدہ ہے۔

ہر آنے والی حکومت اپنی مرضی اور مفاد کی تبدیلیاں لانے کی کوشش کرتی ہے۔ جبکہ آج تعلیم کے مسئلے پر جنگی جنون کی طرح کام کرنے کی ضرورت ہے اور کم از کم پچاس سال تک کے لئے ایک جدید اور مربوط نظام تعلیم بنا دینا چاہئے۔

تیسری بات سر یہ ہے کہ

جس طرح کی تعلیم ہوگی، اس طرح کی نسلیں پیدا ہوں گی۔

مشرقی پاکستان میں تعلیم کا سارا انتظام ہندو اساتذہ کو دے دیا گیا تھا۔ انہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں سے تحریک پاکستان، نظریہ پاکستان اور قائد اعظم، علامہ اقبال اور ایسے تمام مشاہیر کو یا تو نکال دیا یا ان کے کردار کو مشکوک بنا کر پیش کیا۔ صرف پچیس برس کے اندر وہ نسل ابھر کر آگئی جس نے مغربی پاکستان سے علیحدگی اختیار کر کے بنگلہ دیش بنا لیا۔

اس لئے اساتذہ پر اور نصاب پر بہت سی باتوں کا انحصار ہے۔

سر......! چوتھی اور آخری بات میں یہ کہوں گی کہ

آج والدین بھی لٹھ لے کر ڈگریوں کے پیچھے بھاگ نکلے ہیں۔ سٹوڈنٹ بھی یہی چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ڈگریاں حاصل کر لیں۔ تا کہ اچھی سے اچھی نوکری مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے اندر سے تربیت کا عنصر نکل گیا ہے۔ جبکہ تربیت کے بغیر تعلیم اس طرح ہے جیسے نمک کے بغیر سالن۔

سر......! ان حالات کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ مردہ ذوق

خلو تیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو!"

شعر سنا کر تسنیمہ تھوڑی دیر کے لئے رکی۔ پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"سر......! آپ کو شعر کا مطلب سمجھ میں آ گیا ہے......؟"

انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

"کسی زمانے میں مجھے اقبال کا آدھا کلام ازبر تھا۔ میں ان کا دیوانہ تھا۔ کالج کے زمانے میں۔"

بعد میں انہوں نے اس کانفرنس نما میٹنگ کو وائنڈ اَپ کیا۔ دوبارہ سب کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ آپ میں سے جن شخصیات کی خدمات درکار ہوں گی انہیں مطلع کر دیا جائے گا۔

آخر میں سب کو پُر تکلف چائے پلا کر رُخصت کر دیا۔

❀ ❀ ❀

اگلا ایک ہفتہ تسمیہ کا بہت بے قراری اور اضطراب میں گزرا۔ اس کو احساس ہونے لگا تھا جیسے اس نے پہلے دن ضرورت سے زیادہ باتیں کر لی تھیں۔ کہیں وہ عطار قادری صاحب پر منفی اثر نہ چھوڑ کے آئی ہو۔

انتظار کر کر کے جب اسے یقین ہوگیا کہ اسے منتخب نہیں کیا جائے گا تو اسی دن اس کی کال آگئی۔ اسے منتخب کر لیا گیا تھا اور اگلی سوموار کو تفصیلی انٹرویو کے لئے بلایا تھا۔ سوموار کو اس نے ایک سادہ سا سوٹ پہنا۔ آئینے کے آگے کھڑی جوڑا بنا رہی تھی کہ وران آگیا۔

"ماما...... آج پھر کسی پر بجلی گرانے جا رہی ہیں......؟"

"کمینے...... تو باز نہیں آئے گا۔"

وہ مڑ کر بولی۔

"قسم سے ماما...... میں تو خوش ہو رہا ہوں کہ آپ تو پہلے والی ماما بنتی جا رہی ہیں۔ سمارٹ...... ایک دم سے فٹ...... اچھا بتائیں تو سہی...... ارادے کدھر کے ہیں......؟"

"دانی...... میں نے تجھے بتایا نہیں تھا، اس نئے پروجیکٹ کے بارے میں......؟ شکر ہے انہوں نے مجھے سلیکٹ کر لیا ہے۔ آج دوسری

ملاقات ہے وہاں۔"

وہ اپنی ہر بات اور ہر ملاقات سونے سے پہلے وران کو بتا دیا کرتی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ قبلہ قادری صاحب بڑے خوش ذوق واقع ہوئے ہیں۔"

اس نے شرارت سے کہا۔

"دانی...... بڑا شاندار شخص ہے۔ نوکری پکی ہو جائے تو میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گی۔ دیکھو دانی...... زندگی سے کچھ سیکھنا ہو تو ہمیشہ کامیاب ترین لوگوں سے ملتے رہنا چاہئے۔"

بڑے وقار کے ساتھ تسمیہ جب ان کے دفتر میں داخل ہوئی تو عطار صاحب کھڑے ہوگئے۔

اس نے سلام کیا۔

جواب دے کر بولے۔

"تشریف رکھئے......!"

اور کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مسز تسمیہ ربانی......؟"

انہوں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یا مس تسمیہ ربانی......؟"

"سر...... اس عمر میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آپ مس کہیں یا مسز

کہیں۔"

بڑے سلیقے سے وہ جواب ٹال گئی۔

"اس روز کی میٹنگ میں پانچ خواتین اور بیس حضرات شامل تھے۔ شاید آپ کے علم میں ہو......؟"

وہ کہنے لگے۔

"مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے صرف دو کو منتخب کر سکا۔ دو مرد حضرات کا انٹرویو آپ سے پہلے کر چکا ہوں اور تیسری آپ ہیں۔"

"جی......! یہ میری خوش نصیبی ہے۔"

وہ بولی۔

"پتہ نہیں یہ خوش نصیبی آپ کی ہے یا میری...... تاہم مقصد کے حصول کے لئے یہ خوش آئند بات ہے۔ اس روز آپ کے حقیقت پسندانہ خیالات نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ آپ نے صرف پڑھایا ہی نہیں، بلکہ صورتِ حال پر غور بھی بہت کیا ہے۔ میں نے آپ کی C.V کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔"

وہ خاموش ہوگئے۔

"جی سر......!"

وہ بے چین ہوگئی۔

"آپ نے آکسفورڈ سے بھی ڈگری لی ہے اور وہاں پڑھایا بھی ہے۔"

"جی سر......!"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ دوسری یونیورسٹیوں سے کسی بھی پاکستانی یونیورسٹی کا موازنہ کر سکتی ہیں اور نصاب بھی ترتیب دے سکتی ہیں۔"

"سر......! میں پچھلے پانچ سالوں میں پاکستان کے اندر بھی کام کرتی رہی ہوں۔"

"اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔"

"میں پاکستان کے متوسط طبقے میں پیدا ہوا تھا۔ ہائر ایجوکیشن کے بعد مجھے بھی ہاورڈ یونیورسٹی میں جانے کا شوق چرایا۔ مجھے وہاں آسانی سے داخلہ مل گیا۔ میرٹ کی بنا پر ڈگری حاصل کرنے کے بعد مجھے وہاں پڑھانے کا موقع بھی ملا۔ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیتا رہا۔

وہاں اپنا کیریئر بنایا...... جائیداد بنائی...... پیسہ بنایا...... زندگی کو یکسر آسودگی کی ڈگر پر ڈال دیا۔ ایک خاص مقام کو حاصل کر لینے کے بعد اچانک میرے دل کے اندر ایک احساس جاگا کہ اب مجھے اپنی قوم اور اپنے وطن کے لئے کچھ خدمات سرانجام دینی چاہئیں۔ خصوصیت سے نائن الیون کے بعد تو یہ جذبہ جنون بن گیا۔

میرے ذہن میں سوچ بچار کے بعد ایک منصوبہ بننے لگا کہ مجھے مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہاورڈ یونیورسٹی کی طرز کی ایک یونیورسٹی بنانی چاہئے۔ جس میں دنیا بھر کے تمام علوم و فنون رکھے جائیں گے۔ مگر کردار سازی اور خود آگہی کا نصاب ایک خاص طرز پر رکھا جائے گا۔

آپ کی اس روز کی تجویز بالکل میرے خیالات کی عکاسی کر رہی تھی کہ تعلیم میں تربیت کا عنصر بہت ضروری ہے۔

میں مغربی تہذیب اور تعلیم کا مخالف نہیں ہوں۔ میں نے دانستہ اپنی
یونیورسٹی ہاورڈ یونیورسٹی کے شہر بوسٹن کے اندر بنائی ہے۔ اس کا نام ہے۔

"پاک الفلاح انٹرنیشنل یونیورسٹی۔"

بوسٹن میں اس یونیورسٹی نے کام شروع کر دیا ہے۔ اس میں دنیا کی
ہر قومیت کے سٹوڈنٹ داخلہ لے سکیں گے۔ مگر اس کا خصوصی فوکس عالم
اسلام کی نئی نسلوں پر ہوگا۔

مس ربانی......! معاف کیجئے۔ میری بات کچھ طویل ہوگئی۔ اور اب
میں اسے وائنڈ اَپ کرتا ہوں۔

سرِدست میں نے امریکہ میں یہ یونیورسٹی کھول دی ہے۔ اس کی
ایک شاخ پاکستان میں کھولنے کے لئے آیا ہوں۔ بعد ازاں اس یونیورسٹی کی
شاخیں ہر اس مسلم ملک میں کھول دی جائیں گی جہاں جہاں ہمیں اجازت ملتی
جائے گی۔"

"یہ اور بھی اچھی بات ہوگی سر......! بلکہ یہ اکیسویں صدی کا کارنامہ
ہوگا۔"

تسمیہ بولی۔

"فی الحال یہاں یہ بلڈنگ کرایے پر لے کر میں یونیورسٹی کا افتتاح
کر چکا ہوں۔ سٹوڈنٹ کے داخلے کا کام مکمل ہوتے ہی آپ تینوں اس میں
کام کرنا شروع کر دیں گے۔

آپ کل آکر جوائن کر لیں۔ آپ کو "پاک الفلاح انٹرنیشنل
یونیورسٹی" کا بوسٹن والا نصاب اور طریقہ کار مل جائے گا۔ انہی خطوط پر آپ

لوگ یہاں کام کریں گے۔ اور تین مہینے کے اندر مجھے ایک نصاب ترتیب
دے کر دیں گے۔"

"جی سر......!"

تسمیہ نے ادب سے کہا۔

"میں نے صرف تین لوگ منتخب کئے ہیں۔ کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے
کہ باصلاحیت اور محنتی ٹیم میں ایک آدمی بھی ہو تو وہ دس آدمیوں کے برابر کام
کر سکتا ہے۔ اس کے لئے ہجوم اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک ہے سر......!"

"ایک بات رہ گئی......!"

"وہ کیا سر......؟"

"وہ یہ کہ میں آپ کو فی الحال چار ہزار ڈالر ماہانہ تنخواہ دوں گا۔
تنخواہیں ڈالروں میں ہی ملا کریں گی۔"

"سر......!"

وہ گھبرا کر رک گئی۔

"میں کیا کہوں اب......؟"

"کیا آپ کو اتنی تنخواہ منظور نہیں......؟"

"جی نہیں......! جی جی......! میرا مطلب یہ نہیں تھا سر......! جو کام
آپ کرنے جا رہے ہیں۔ اس میں تو سر......! میں بغیر تنخواہ کے بھی کام کرنے
پر آمادہ ہو جاؤں گی۔ آخر ہم لوگ یعنی اُستاد طبقہ ملک و ملت کے لئے آگے
نہیں آئیں گے تو پھر کون آئے گا......؟"

"یہ ہوا نہ جذبہ......!"

وہ مسکرائے۔

"اس جذبے کی مجھے تلاش تھی۔ ایک بات اور بھی ہے۔ میں آپ تینوں کو گاہے بگاہے اپنی انٹرنیشنل یونیورسٹی میں بلاتا رہوں گا۔ تاکہ آپ کے کام کرنے کے انداز میں یک جہتی اور یکسانیت پیدا ہو۔"

"اس کا مطلب ہے آپ یہاں نہیں رہیں گے سر......؟"

یہ کہہ کر وہ ایک دم گھبرا گئی۔

"تین ماہ آپ کے ساتھ کام کروں گا۔ پھر میں گھومتا پھرتا رہوں گا...... نگر نگر...... ڈگر ڈگر...... کام کرنے کا انداز یہی ہوگا۔ گھبرائیں نہیں...... میرا ہر قسم کا تعاون ہر حال میں میرے سٹاف کو حاصل رہے گا۔"

"ظاہر ہے ہم بھی آپ کی راہنمائی میں کام کرنا چاہیں گے۔"

وہ بولی۔

"مس ربانی......! آپ ملک سے باہر کتنی یونیورسٹیوں میں ملازمت کرسکی ہیں......؟"

"سر......! میں نے C.V میں لکھا ہے۔ عرصہ پہلے آکسفورڈ گئی تھی......بس وہیں سروس کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔"

"کس سن میں آپ وہاں تھیں......؟ ذرا دیکھیں۔"

وہ اس کی فائل کے صفحات اُلٹ کر دیکھنے لگے۔

وہ بھی جلدی جلدی زبانی ان دنوں کی تفصیل بتانے لگی۔

"انہی دنوں وہاں تیسری دُنیا کے مسائل کے بارے میں ایک سیمینار

ہوا تھا جس میں میں نے ایک مقالہ تعلیم کے بارے میں پڑھا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر اس کو بہت Response اور کوریج ملی تھی۔"

"ارے......!"

وہ آنکھیں بند کر کے سوچتے ہوئے بولے۔

"اس سیمینار میں تو میں بطورِ خاص گیا تھا۔ میں نے بھی ایک Session میں پیپر پڑھا تھا۔"

"ہاں ہاں......!"

اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"آپ...... آپ...... او خدا......! اچھا تو وہ آپ تھیں......؟ ایسا لگتا ہے زمانہ بیت گیا۔

تبھی تو جب یہاں پہلے دن میں نے آپ کو دیکھا تھا تو بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے......؟

ہاں......! اب رفتہ رفتہ یاد آ رہا ہے۔ اس سیمینار میں آپ کی بہت واہ واہ ہوئی تھی۔ مجمع آپ کے گرد تھا۔

آپ کو تو شاید یاد بھی نہ ہو۔ میں اپنی بیوی ربیکا کے ساتھ آپ کے پاس آیا تھا اور آپ کے مقالے کی تعریف بھی کی تھی۔

خیر...... یہ بات یاد رکھنے کے قابل کہاں تھی...... سو خوشی ہوئی کہ ایک قابل قدر ہستی کو میں نے تلاش کر لیا۔"

تسبیح جست لگا کر پیچھے چلی گئی اور اس نے ذہن کی کوٹھڑی میں رکھا ہوا وہ لمحہ ڈھونڈھ نکالا۔ جب یونانی دیوتاؤں جیسا ایک شخص اپنی خوب صورت

بیوی کے ہمراہ اسے مبارک باد دینے آیا تھا اور وہ رشک کا گھونٹ بھر کے بس اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ شخص عمر کی کتنی منزلیں پھلانگ چکا تھا۔ خود وہ بھی۔

ابھی وہ اس گم شدہ لمحے کو سمیٹ کر سوچ رہی تھی کہ اسے کس طرح الفاظ میں ڈھالے۔

ڈھالے یا ان کہا چھوڑ دے۔

زندگی میں بہت سے لمحے ان کہے گزرتے ہیں۔

مگر وہ ذہن کی برفانی سطحوں پر کہیں جا کر ٹھہر جاتے ہیں۔

کریدو تب نکل آتے ہیں۔

ابھی وہ ذہن کی سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی کہ وہ کھڑے ہوگئے۔

''آج بہت باتیں ہوگئیں۔ چلئے میں آپ کو آپ کا نیا کیمپس دکھا دوں۔''

ایک تابعدار شاگرد کی طرح وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

❀❀❀

ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جونہی وہ کیمپس میں داخل ہوئی، صدر دروازے کے اوپر علامہ اقبال کا یہ شعر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

کیا خبر میری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ میری خاک میں ہے

پھر جوں جوں وہ کمرہ کمرہ دیکھتی گئی، دیوار و در اسے علامہ اقبال کے کلام سے مزین نظر آئے۔ اسے اپنے آپ سے شرم آئی۔ جب اس نے پہلے ان عطار صاحب سے پوچھ گیا تھا کہ انہیں علامہ کے شعر کا مطلب سمجھ میں آیا ہے.....؟

کسی کمرے میں کلاس ہو رہی تھی۔ کسی کمرے میں لیکچر ہو رہا تھا۔

طلباء اور طالبات بھی ابھی کم نظر آ رہے تھے۔

سارا کیمپس اسے دکھا کر عطار صاحب اپنے دفتر میں آگئے اور بولے۔

''آپ کو زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔ مگر ہمیں اپنی یونیورسٹی کے لئے ایک معقول اور مربوط نصاب کی فوری ضرورت ہے۔ ہم کب تک دوسروں کا نصاب اپنی قوم کو پڑھاتے رہیں گے.....؟''

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر......!"

وہ بولی۔

"تو آپ کل سے آجائیں۔ میں ابھی تین ماہ یہاں ہوں۔ ہم چاروں بیٹھ جایا کریں گے اور طے کریں گے کہ میٹرک کر کے جو طلباء اور طالبات کالج میں آجاتے ہیں، وہ کیا پڑھنا چاہتے ہیں......؟ اور ہمیں ان کی راہنمائی کس طرح کرنی چاہئے......؟"

"جی سر......!"

"ہمارے ہاں زیادہ تر لوگ ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سر......!"

"میں نے اس لئے اپنے ادارے میں برائے نام فیس رکھی ہے تاکہ ہم اپنی مرضی کی تربیت دے سکیں۔"

"جی ٹھیک ہے......!"

تسبیحہ ادب سے بولی۔

"آپ یہ سمجھ لیں مس ربانی......! کہ ہم نے پاکستان کے لئے ایک نئی نسل جنم دینی ہے۔ بنانی نہیں، جنم دینی ہے۔ جو انگریزی تعلیم حاصل کرے مگر مغربی تہذیب سے مزین نہ ہو جو انگریزی تو فرفر بول لیتی ہو مگر اُردو بولنے میں فخر محسوس کرے۔ جو سوٹ بوٹ نکٹائی خوب پہن لیتی ہو۔ مگر شلوار قمیص کو نفرت سے نہ دیکھے۔ جو شیکسپیئر، بائرن، ٹی ایس ایلیٹ کو شوق سے پڑھتی ہو مگر علامہ اقبال اور قائداعظم کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہو۔"

تسبیحہ حیرت سے بس ان کے چہرے کو دیکھتی جا رہی تھی۔ پلک جھپکنا بھول گئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں۔ عام طور پر جو خوب صورت شخصیات ہوتی ہیں، وہ خوب صورت باتیں نہیں کرتیں۔ ان کے کردار میں جھول ہوتا ہے۔ بعض اوقات ان کے قریب جا کر بڑی کوفت ہوتی ہے۔

مگر وہ اس طرح بول رہے تھے جیسے کوئی جھرنا کھل جاتا ہے۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا۔

"اصل میں مس ربانی......!

یہ جو تعلیمی ادارے ہوتے ہیں، یہ علمی درس گاہیں جو مختلف ناموں سے کھڑی ہو جاتی ہیں، یہ کبھی بھی کمرشل ادارے نہیں تھے۔ یہ وہ بھٹیاں تھیں جہاں کچی مٹی کے برتن لائے جاتے ہیں اور ایندھن میں ڈال کر انہیں مضبوط بنایا جاتا ہے۔ ناپختہ ذہن کے طلباء اور طالبات ان اداروں میں آتے ہیں۔ اساتذہ ان کو صحیح راستہ اور صحیح سمت عطا کرتے ہیں۔ ان کو زندگی اور بندگی کا فلسفہ سمجھاتے ہیں۔

ہر شعبہ زندگی میں ان اداروں سے نکل کر لوگ جاتے ہیں۔ کوئی قانون کی تعلیم حاصل کرتا ہے تاکہ جج بن سکے۔ کوئی فوج میں چلا جاتا ہے جس کی آخری منزل جرنیل ہو سکتی ہے۔ کوئی سائنس دان بنتا ہے۔ کوئی استاد بنتا ہے۔ کوئی تاجر بننا چاہتا ہے۔ کچھ لوگ کارخانے اور فیکٹریاں لگانا چاہتے ہیں۔ بعض لوگ پولیس میں جا کر خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔ کوئی سیاست میں جا بیٹھتا ہے۔

علیٰ ھذا القیاس...... کوئی شعبہ لے لیں۔ اسی راستہ سے کامیاب ہو کر

اپنی منزل ملتی ہے۔"

انہوں نے حیران بیٹھی تسبیحہ کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر بولے۔

"میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پرائمری کلاس سے ہی بھاگ گیا ہو مگر اسے پرائمری میں اچھا اُستاد مل گیا ہو تو وہ چاہے چھابڑی لگائے، ریڑھا چلائے، کھوکے میں پان بیڑی فروخت کرے، ٹیکسی چلائے یا رکشہ..... اس کے کردار کے اندر ایک بہترین انسان والی بات پیدا ہو چکی ہو گی۔

پیشہ کوئی برا نہیں ہوتا۔ بری تربیت اسے داغدار کر دیتی ہے۔ میں تو کوشش کر رہا ہوں۔ اسی ادارے سے پرائمری سکولوں کے ٹیچر بنا کر بھیجوں۔

کسی بچے کے لئے ابتدائی تعلیم پر توجہ دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔

اگر شروع میں شاخ سیدھی نہ کی جائے گی تو پھر درخت ٹیڑھا ہو جائے گا۔ شاخ کی تراش خراش ٹھیک ہونی چاہئے۔

مس ربانی.....!"

انہوں نے اچانک رُک کر پکارا۔

"جی سر.....!"

"آپ سو گئی ہیں.....؟"

"آپ کو کیسے خیال آیا سر.....؟"

"آپ بت بنی بیٹھی ہیں۔"

"سر.....! میری عادت ہے۔ جب میں کسی بات سے بہت متاثر ہوتی ہوں تو گنگ ہو جاتی ہوں۔ مجھے برابر احساس ہو رہا تھا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں نے جو آج جگہ جگہ کھمبیوں کی طرح اُگے کھڑے ہیں، ایسا کچھ

نہیں سوچا تھا۔"

"زیادہ تر ادارے کمرشل بنیادوں پر بنائے گئے ہیں۔"

"جی درست ہے۔"

"آپ ضرور پیسہ کمائیں۔ مگر مشن فروخت کر کے نہیں، ایک بگڑی ہوئی نسل پیدا کر کے نہیں، قوم کو اچھے شہری دے کر..... ایک اچھی نسل بنا کر۔

آج پاکستان میں تعلیم اتنی مہنگی کر دی گئی ہے کہ ایک غریب آدمی جس کے دو چار بچے ہوں، وہ انہیں تعلیم نہیں دلوا سکتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

تسبیحہ بولی۔

"یہ کسی دُشمن نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت کیا ہے۔"

"جی.....!"

"آپ نے پہلے دن کہا تھا نا..... کہ تعلیم طبقوں میں بٹ گئی ہے۔"

"جی سر.....!"

"کیوں.....؟"

"پاکستان میں تو بس یہی طبقہ تھا جس نے پاکستان بنایا تھا اور جسے پاکستان رہنا چاہئے تھا۔"

"سر.....! یہاں تو کئی طبقے بن گئے ہیں۔"

"یہی میں دیکھ رہا ہوں اور اس طبقاتی کشمکش کو مٹانے کے لئے اس میدان میں کودا ہوں۔ ورنہ کام تو اور بھی بہت تھے۔"

"سر.....! اس میدان میں مجھے آپ ہمیشہ اپنے ساتھ پائیں گے۔"

"شاباش......!"

وہ خوش ہو کر بولے۔

"میرا زندگی کا مقصد یہ ہے مس ربانی......! جب آدمی کامیابی کی کسی منزل پر پہنچ جائے تو دم لے کر سوچے۔ اللہ نے یہ مقام عطا کیا ہے۔ میں اب اللہ کے بندوں کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ سمجھ میں آ جائے تو فوراً کام شروع کر دے۔"

"سر......! سچی بات ہے۔ آپ نے مجھے بھی نئی راہ دکھائی ہے۔ میں آج بہت خوش ہوں کہ آپ کے مشن میں شامل ہوگئی۔"

"ہم نے تو کتابوں میں پڑھا تھا کہ قدیم زمانوں میں عظیم لوگوں کے بچے کئی کئی مہینوں کا سفر کر کے دُور دراز کے ملکوں میں علم حاصل کرنے کے لئے جاتے تھے۔ بچپن میں جاتے تھے اور جوان ہو کر لوٹتے تھے۔ جب وہ ایک خوب صورت شخصیت میں ڈھل جاتے تھے۔

آج یہاں ہر ایک کو جلدی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ڈگریاں حاصل کر لیں۔ اپنی شخصیت کی تعمیر کریں یا نہ کریں۔

میں ایک جنونی آدمی ہوں۔"

وہ ہنس کے بولے۔

"میں نے شروعات تو کر دی ہیں۔ اب دیکھیں کہاں تک کامیاب ہوتا ہوں۔"

"سر......! اس دُنیا میں جتنی ایجادات ہوئی ہیں اور جتنے بڑے کام ہوئے ہیں۔ کسی جنونی نے ہی کئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے انشاء اللہ آپ بھی

کامیاب ہوں گے۔"

"میں آج یہ ساری باتیں جذبات میں بہہ کر جانے کیوں آپ کے سامنے کہہ گیا ہوں۔ آپ خوفزدہ تو نہیں ہوئیں......؟"

"نہیں سر......!"

وہ شرما کر بولی۔

"ان کے سحر میں آ گئی ہوں۔"

❁ ❁ ❁

گھر آ کر تسبیحہ نے ساری باتیں حسب عادت درمان کو بتائیں اور وہ پرانا واقعہ بھی جب اس نے پہلے پہل عطار صاحب کو دیکھا تھا۔ نہ ان کا نام جانتی تھی نہ کام...... ویسے ہی متاثر ہوگئی تھی۔

درمان اس کی باتیں سن کر سیٹی بجاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

تسبیحہ لیٹ گئی۔

آنکھیں بند کر کے وقت کی ڈھول میں اپنی یادداشت کا ہاتھ ڈال دیا۔ ذرا ذرا سی ہر بات کھوجنے کی کوشش کی۔ مگر وہاں باتیں ہی کتنی تھیں۔ ایک شخص اپنی بیوی کو ساتھ لئے آیا تھا۔ تسبیحہ نے بس نظر اُٹھا کر دیکھا تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ سنا ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بس رشک سے اس کی خوبرو بیوی کی طرف دیکھا اور خاموش ہوگئی۔

دوسری بار وہیں سیمینار کے ڈنر میں دونوں میاں بیوی کو دُور سے دیکھا تھا۔

اور تیسری بار ہوٹل میں بیٹھی تھی۔ جب یہ بنا سنورا جوڑا لابی سے گزرا تھا اور پاس بیٹھے مدہوش صاحب نے اس کی نظر کی چوری پکڑ لی تھی۔ تب اسے بات بنانی پڑ گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کہاں کہاں سے لا کے جوڑا بنا دیتا ہے۔

مگر یہاں تک سوچتے سوچتے...... یکا یک اس کا ذہن شل ہوگیا۔

سورج کی تمازت میں چمکتے ہوئے یاد کے ایک ذرے پر مدہوش صاحب کی صورت سیاہ بدلی کی طرح چھا گئی تھی۔

اس کے دل سے درد کی ہوک اُٹھی۔ وہ کتنی احمق تھی۔ اسے انسانوں کی پہچان نہیں تھی...... یا وہ اپنی تنہا لق و دق زندگی سے اُکتا گئی تھی۔ وہ مدہوش صاحب کی باتوں کے چھل میں آگئی تھی اور وہ زبردستی سایہ دار بادل کا روپ دھار کے اس کی زندگی میں آ گئے۔

بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا......

بہنوں کا اصرار......

اور ابو جی کی وصیت نے مل کر اسے لوٹ لیا......

کاش اس نے شادی نہ کی ہوتی......

اور آج تک زندگی اس ایک لمحے کے انتظار میں گزار دی ہوتی......

تو بھی اس شخص کا ملنا کتنا اچھا لگتا......

اپنی گزری ہوئی درد و اندوہ کی ساری زندگی کی کربناک یادوں نے اسے مضطرب کر دیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا کچھ اس کے ساتھ ہوگیا اور وہ پھر بھی سلامت رہی۔ شاید اس کام کے لئے جو اسے اب سونپ دیا گیا تھا۔

ہاں ان تپتے ہوئے حالات کے الاؤ نے اسے اولاد جیسی نعمت دی۔

عجیب دستور ہے قدرت کا...... اولاد کو ایک نعمت بنا دیا...... ماں کو سب سے بڑا رُتبہ دے دیا...... اگر وہ شادی نہ کرتی تو ماں کیسے بنتی......؟

ماں ہونا دنیا کی سب سے بڑی خوشی بھی ہے۔عورت کی تکمیل ہے۔
اولاد چاہے مکروہ ترین آدمی میں سے ہو۔ ماں کو پیاری لگتی ہے۔
ماں خالق ہے۔
اور اولاد مخلوق ہے۔
خالق کو اپنی مخلوق سے بہت پیار ہوتا ہے۔
''بارِالٰہی......!''
اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔
''تیرے کام تو ہی جانے......!
بندے اس قابل کہاں کہ تیری مصلحتیں سمجھ سکیں۔''
وہ رونے لگی۔
رو کر اسے چین آ گیا۔
اگلے دن وہ نئے جذبے کے ساتھ کیمپس پہنچی اور باقاعدہ کام شروع کر دیا۔

تین ماہ بعد جب عطار قادری واپس جانے لگے تو انہوں نے تسبیح کو دفتر میں بلایا۔
''جی سر......!''
وہ جاتے ہی بولی۔
''بیٹھیے مس ربانی......! کیا میں آپ کو آپ کے نام سے بلا سکتا ہوں......؟''
''جی سر......!''

وہ بیٹھتے ہی بولی۔
''بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے......؟''
''آپ کا نام بہت خوب صورت ہے اور منفرد ہے۔''
''میرے ابو جی نے رکھا تھا۔ بتایا کرتے تھے جب امی ہسپتال میں گئیں اور تکلیف میں مبتلا ہوئیں تو انہوں نے تسبیح ہاتھ میں پکڑ لی اور باہر بنچ پر ساری رات بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے ناموں کا وِرد کرتے رہے۔ جب صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں تو میں پیدا ہوگئی۔
نرس نے آ کر کہا۔
''تسبیح ہلانا بند کریں۔آپ کی بیٹی آ گئی ہے۔''
''میری تسبیح آ گئی۔''
ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
تب انہوں نے میرا نام تسبیح رکھ دیا۔ یعنی ذکر کرنے والی۔ مگر پیار سے مجھے تسبیح ہی بلاتے تھے۔سر......! آپ بے شک میرا نام بلائیں۔''
''ہاں......! میں بھی آپ کو تسبیح ہی بلاؤں گا۔ مجھے یہ آئیڈیا بہت اچھا لگا ہے۔''
''مجھے خوشی ہوگی سر......! کہ ابو کے بعد کسی نے مجھے اس نام سے بلایا۔''
''اور یہ کیا آپ سر، سر کہتی رہتی ہیں......؟ ہم سب تقریباً ایک ہی عمر اور ایک ہی سٹیٹس کے لوگ ہیں۔مغرب میں کولیگز میں ایسے تکلفات نہیں ہوتے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ بھی میرا نام بلائیں۔ مجھے صرف عطار کہیں۔''

"جی......ٹھیک ہے......!"

وہ اسے بہت سے کام سمجھاتے رہے۔

"میں اسی طرح سفر میں رہتا ہوں۔ اسلامی ملکوں میں آتا جاتا رہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے نئی شاخوں پر بھی کام کرنا ہوتا ہے۔ مگر اس بار میں پاکستان سے مطمئن جا رہا ہوں۔ مجھے تینوں ساتھی بہت اچھے مل گئے ہیں۔ باری باری میں آپ تینوں کو بھی بوسٹن بلوا کر اس یونیورسٹی میں کام کرنے کا موقع دوں گا۔"

جب وہ بہت سی ہدایات دے کر اُٹھ کر جانے لگے تو تسبیحہ نے کہا۔

"عطار صاحب......! اگلی بار اپنی مسز کو ضرور ساتھ لایئے گا۔"

وہ سوگواری سے مسکرائے۔

"وہ اب میرے ساتھ نہیں ہے۔"

"کیا کہا......؟"

وہ ہکلانے لگی۔

"اس نے......"

"نہیں......! وہ اللہ کے پاس چلی گئی ہے۔ ہم دونوں نے مل کر یہ کام شروع کیا تھا۔ وہ راہ میں تھک گئی شاید...... اب میں تنہا اس کی تکمیل کو نکل کھڑا ہوا ہوں۔"

"اُفوہ......! آئی ایم سوری......!"

وہ واقعی شرمندہ سی ہوگئی۔ پھر اور کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

❀❀❀

عطار صاحب کے جانے کے بعد وہ پاگلوں کی طرح کام میں جت گئی۔ وہ زیادہ تر ذمہ داری بھی اسی پر ڈال کر گئے تھے۔ پتہ نہیں تسبیحہ کو یہ کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ قدرت نے اسے بس اسی کام کے لئے بنایا تھا۔ وہ جس کام کے لئے چنی گئی تھی وہاں پہنچ گئی ہے۔

پورا ایک سال لگا نیا نصاب ترتیب دینے میں۔ باقی پروفیسرز بھی اس کی راہنمائی کرتے رہتے تھے۔ پھر نئے سال کے داخلے شروع ہوگئے۔ لوگوں کا رجوع خودبخود اس نئی یونیورسٹی کی طرف ہوگیا۔ داخلوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی۔

تسبیحہ کے اندر جیسے ایک نئی توانائی آگئی تھی۔ ہر کام بڑی دلجمعی سے کرتی رہتی تھی۔ اس کے بچے بھی اس مثبت تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔

درمان ہر روز ماما کے کارناموں کی تفصیل بڑی بہن اور بھائی کو بتا دیتا تھا۔ آمدنی بڑھ جانے سے گھر کا ماحول بھی کافی بدل گیا تھا۔ تسبیحہ نے قسطوں پر نئی موٹر خرید لی تھی۔ اب کی چھٹیوں میں تسمیہ اور تابش باری باری اپنی ماما کی فتوحات دیکھنے آئے تھے۔ نیا کام شروع کرنے پر اسے مبارک باد بھی دی تھی اور خوش ہو کر تابش نے کہا تھا۔

"ماما......! آپ بالکل پہلے والی ماما ہوگئی ہیں۔ چاق و چوبند او ردلکش۔"

"ماماجی......!"

ہنستے ہوئے بولا۔

"آپ کو اگر کوئی اچھا سا اپنی طرز کا آدمی مل جائے تو بے شک شادی کر لینا۔

"گدھے ہوتم......!"

اس نے ڈانٹا۔

"ہاں ہاں......! بھائی جان......! میں بھی یہی کہتا رہتا ہوں۔"

درمان بیچ میں بولا۔

"کہ ماما......! میری شادی سے پہلے تم شادی کر لو۔ ہم خودغرض بچے ہیں۔ بعد میں کہیں مکر نہ جائیں۔"

تسمیہ ایسے مشوروں کو بس مذاق کی حد تک لیتی تھی۔

جب تسمیہ آئی تو وہ بھی بولی۔

"سوال یہ ہے اس عمر میں کون اتنا مخلص ہوگا۔ اگر مخلص بندہ مل جائے تو ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ہمیں تو اپنی ماما کی خوشی اور زندگی ہر حالت میں عزیز ہے۔"

مگر وہ جواب میں ہمیشہ کہتی۔

"مجھے اپنی بے کار زندگی میں ایک بہت ہی عظیم کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں یہ کام تکمیل تک پہنچا لوں تو سمجھنا کہ میرا دنیا میں آنے کا مقصد

پورا ہوگیا۔"

اس نے خود محسوس کیا تھا کہ اس ادارے میں کام کرتے ہوئے وہ بہت مسرور رہتی تھی۔ تھکاوٹ نام کو نہ ہوتی۔

اس سال عطار صاحب دو مرتبہ پاکستان آئے تھے۔ جب وہ عطار صاحب کی معیت میں ہوتی تو اور بھی گرم جوش ہو جاتی۔

کام کرتے ہوئے وہ مستقل ان کا چہرہ، ان کا لباس، ان کی حرکات و سکنات دیکھتی رہتی۔ ان کا طرزِ عمل بہت متاثر کن تھا۔ وہ جب کوئی بات سمجھانے کے لئے مسلسل ہدایات دیتے تو یہ ان کے چہرے پر نظریں ٹکائے رکھتی۔ پلک بھی نہ جھپکتی۔ اگر وہ رُک کر اسے غور سے دیکھتے تو یہ نظریں فوراً جھکا لیتی۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر اپنی بات شروع رکھتے۔

وہ خود بھی حیران ہوتی تھی۔

اب وہ ساٹھ سال کی ہوگئی تھی۔

اس کے خوابوں کا شہر ویرانہ ہوئے بھی مدتیں گزر گئی تھیں۔

مگر نہ جانے یہ کون سا موڑ تھا کہ اس کے اندر بہت سی اُمنگیں سر اُٹھانے لگی تھیں۔ جس طرح کالے علم کے اثر سے سب کچھ پتھر کا ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی آ کر اس پر آبِ حیات چھڑکنے لگتا ہے۔ تو ہر شے زندہ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

اسے بھی لگتا کہ اس کے اوپر کوئی آبِ حیات چھڑک رہا ہے۔ اس کا دل، اس کا جگر، اس کے اعصاب، اس کا ذہن، اس کا لاشعور، اس کی قوتِ متخیلہ، سب جاگ رہے ہیں۔ اُٹھ رہے ہیں۔ زندہ ہو رہے ہیں۔

بے خیالی میں عجیب عجیب خواب دیکھنے لگتی۔ مسکراتی رہتی۔ کام میں جتی رہتی۔

ایسے لگتا کہ اس کے اوپر آسیب کا ایک سایہ تھا۔ جو اچانک ہٹ گیا ہے۔ کوئی چاند گرہن میں آ گیا تھا۔ اب سیاہ بدلیاں چھٹ گئی ہیں اور پہلے والی چکاچوند چاندنی چھن چھن کر آنے لگی ہے۔

وہ اپنے آپ کو خود ہی بتایا کرتی کہ یہ سب عطار صاحب کی وجہ سے ہے۔

وہ ایک شاندار اور پُرکشش آدمی تھے۔ جن کی ہر بات میں ایک وقار تھا۔ تمکنت تھی۔

ان کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ سر پر ایک چاندی کا ٹوکرا رکھا تھا۔ رنگ ان کا ابھی تک سرخی مائل سنہرا تھا۔ اس سنہرے چہرے پر چاندی جیسے بال بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ ان کی باتوں میں مٹھاس تھی۔

تسبیحہ نے ان کی بھرپور جوانی دیکھی تھی اور اب بڑھاپا بھی دیکھ رہی تھی۔

اور وہ کیسا قابل قدر کام کر رہے تھے۔ اپنی ساری کمائی لگا کے پاکستان کے لئے ایک نئی نسل تیار کر رہے تھے۔

کچھ لوگوں کا دُنیا میں موجود ہونا ہی ساری دُنیا کو خوب صورت بنا دیتا ہے۔

کچھ لوگ اپنے وجود میں راحت اور طمانیت چھپائے رہتے ہیں۔

اس لئے جب تک قریب رہتے ہیں، پھول مہکتے رہتے ہیں۔ تارے دمکتے رہتے ہیں۔ کرنیں اُترتی رہتی ہیں۔

کچھ لوگوں کے مشن میں شامل ہو کے زندگی خود قابل صد افتخار ہو جاتی ہے۔

یونیورسٹی کو قائم ہوئے دوسرا سال لگ رہا تھا۔ دُور دُور سے سٹوڈنٹ آ کر داخل ہو رہے تھے۔

پروفیسر عبدالصبور صدیقی، پروفیسر میر نعمت اللہ خان اور تسبیحہ نے مل کر بی اے کا نصاب ترتیب دے لیا تھا۔ اس میں عطار صاحب اور دیگر پروفیسر صاحبان کے مشورے بھی شامل کئے گئے تھے۔

پچھلے دو سالوں میں پروفیسر عبدالصبور صدیقی اور پروفیسر میر نعمت اللہ خان چھ چھ ماہ کے لئے امریکہ گئے تھے اور پاک الفلاح انٹرنیشنل یونیورسٹی سے ٹریننگ اور نیا علم حاصل کر کے واپس آ گئے تھے۔

اس سال تسبیحہ نے چھ ماہ کے لئے اپنا کورس مکمل کرنے کے لئے جانا تھا۔

وہ بڑی ایکسائیٹڈ تھی۔ مگر بار بار تیاری کے دوران درمان سے پوچھتی۔

''تو اکیلا گھبرائے گا تو نہیں......؟''

وہ بھی ہنس کر کہتا۔

''ماما......! اگر میں تنہائی سے گھبرا گیا تو اپنی کسی گرل فرینڈ کو گھر لے آؤں گا۔ مگر ماما......! میرے بغیر تمہارا دل نہ لگا تو کیا کرو گی......؟''

"روز فون کر کے تمہیں تنگ کیا کروں گی۔"

"نہیں......! مجھے سبق سکھانے کے لئے ماما......! تم بھی کوئی بھلا سا بوائے فرینڈ بنا لینا۔"

اس پر دونوں قہقہے لگا کے ہنسنے لگ جاتے۔

اسے اپنے بچوں پر فخر محسوس ہوتا جو ایسی دوستانہ یک جہتی رکھتے تھے اور دوستوں کی طرح مذاق بھی کر لیتے تھے۔

❀ ❀ ❀

تقدیر کہاں لے آئی ہے......؟

اے ربِّ کائنات ، مجھے ایک رات دے
تو مان میری بات ، مجھے ایک رات دے
عوضانۂ حیات ، مجھے ایک رات دے
بس ایک رات دے مگر اب اس کے ساتھ دے!!

تسبیحہ نے نیویارک سے جہاز بدلا تھا اور اب بوسٹن کے ائیرپورٹ پر کسٹم اور امیگریشن کے مراحل سے فارغ ہو کر گھبرائی گھبرائی اپنی سامان والی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آ کے شیشے کے پاس کھڑی ہوگئی تھی۔ جہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

برفباری بھی باقاعدہ ہو رہی تھی۔ پہلی بار امریکہ آئی تھی۔ نہ کوئی جان نہ پہچان...... ویسے یونیورسٹی کے پی آر او نے اسے اطلاع دے دی تھی کہ یونیورسٹی کی طرف سے کوئی اسے ریسیو کر لے گا۔

اگر اس شدید برفباری میں کوئی نہ آیا ہوا تو وہ کیا کرے گی....

رات کہاں بسر کرے گی......؟ اس نے اپنی ٹیلی فونوں والی چھوٹی سی ڈائریکٹری نکالی تاکہ یونیورسٹی کے متعلقہ شعبہ کے نمبر نکال کر سامنے رکھ لے۔

یکایک شیشہ پر ٹھک ٹھک ہوئی۔

گھبرا کر اس نے نظر اٹھائی۔

شیشے سے اس پار اپنے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ عطار صاحب کھڑے تھے۔ ننھی ننھی برف کی پھوہار ان کے چہرے اور برفانی ٹوپی پر پڑی

ہوئی تھی۔ عجیب دیومالائی شخصیت لگ رہے تھے۔

وہ اندر کھڑی پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ اجنبیت کے خوف سے۔

انہیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

انہوں نے ہاتھ سے مین دروازے کی طرف اشارہ کیا کہ ادھر سے آجائیں۔

اس نے نوٹ بک پرس میں رکھی۔ ماتھے کا پسینہ پونچھا اور ٹرالی اس طرف گھمائی جس طرف سے لوگ باہر نکل رہے تھے۔ پہلے تو اس لئے نکل کر نہیں کھڑی ہوئی تھی۔ ایک تو برف باری کا خوف تھا۔ دوسرے اگر کوئی نہ آیا ہوا تو اسے دوبارہ فون کرنے کے لئے اندر آنا پڑے گا۔

اگرچہ اندر لاؤنج کافی گرم تھے مگر پسینہ اسے پریشانی کی وجہ سے آگیا تھا۔

وہ قطار میں لگ کے باہر نکلی تو عطار صاحب پیشوائی کو بڑھے۔

ان کے ہاتھ میں سرخ کارنش کے پھولوں کا گلدستہ تھا۔ ویل کم ٹو امریکہ کہہ کر انہوں نے یہ گلدستہ تسبیحہ کو پیش کیا اور ٹرالی خود پکڑ لی۔

وہ باہر پورچ کے تلے آگئے۔ اور بولے۔

"آپ یہاں ٹھہریں، میں پارکنگ سے گاڑی یہاں لے آتا ہوں۔"

تسبیحہ نے گلدستہ پکڑ کے شکریہ ادا کیا اور ایک طرف ہو کے کھڑی ہوگئی۔

وہ ٹرالی پکڑ کر پارکنگ کی طرف روانہ ہوئے۔ تسبیحہ نے انٹرنیٹ پر بوسٹن کا موسم دیکھ لیا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہاں آج کل برفباری ہو

رہی ہے۔ کیونکہ یہ جنوری کا اوائل ہفتہ تھا۔ اس نے لمبے سوئٹر کے ساتھ احتیاطاً ایک گرم شال پکڑ لی تھی۔ کیونکہ پاکستان میں تو کبھی گرم کوٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ لندن میں اس نے کوٹ پہنے تھے بعد میں وہ بھی ناقابل استعمال سمجھ کر کسی کو دے دیئے تھے۔

لاؤنج سے باہر نکل کر جب شدید سرد ہوا کا پہلا جھکڑ محسوس ہوا تو وہ کانپنے لگی۔ اس نے شال کھول کر کاندھوں پر ڈال لی تھی۔ پھر بھی اس کی ٹانگیں سردی سے کانپنے لگیں۔

"سب سے پہلے ایک لمبا گرم کوٹ خریدنا پڑے گا۔"

اس نے دل میں فیصلہ کیا۔ اتنے میں گول دائرے سے گاڑی نکال کر عطار صاحب اس کے قریب آکر رُکے۔ گاڑی کھڑی کر کے انہوں نے پچھلا دروازہ کھولا تو وہ سمجھی کہ اس کے بیٹھنے کے لئے کھولا ہے۔ اندر سے انہوں نے ایک فر والا لمبا کوٹ نکالا اور قریب آکر اس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔

نہایت قیمتی کالا کوٹ...... جو اسے بالکل پورا آیا۔

"بہت بہت شکریہ عطار صاحب......!"

اس نے شرما کر کہا۔

اس بار انہوں نے اگلا دروازہ کھولا اور تسبیحہ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

وہ آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

وہ دوسری طرف سے آکر اسٹیئرنگ کے آگے بیٹھ گئے۔

ابھی وہ ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھی کہ عطار صاحب بولے۔

"میں نے آپ کا سوٹ کیس ڈگی میں رکھ دیا ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔

"آپ سارے کام جادو کی طرح کر دیتے ہیں۔"

"کون سے کام بھئی......!"

وہ گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے بولے۔

"ابھی میں سوچ رہی تھی کہ پہلا کام یہاں پہنچتے ہی یہ کروں گی کہ نئے ڈیزائن کا ایک کوٹ خریدوں گی۔ آپ نے میرے خیالوں جیسا کوٹ لا کے مجھے پہنا دیا۔"

"یہ بالکل میرے سائز اور میری پسند کا ہے۔ یہ تو وہی شخص کر سکتا ہے جو جادو کا علم جانتا ہو۔"

وہ بڑے پیارے انداز میں ہنسنے لگے۔

"آپ کا تعریف کرنے کا انداز بھی بڑا انوکھا، نرالا ہے اور مجھے پسند بھی آیا ہے۔"

"ہفتہ، اتوار کو یونیورسٹی کے لوگ چھٹی کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے انہیں کہہ دیا تھا۔ میں آپ کو ریسیو کر لوں گا۔ برفباری کی وجہ سے میں ایئرپورٹ پر ذرا پہلے آ گیا تھا۔ وقت گزاری کے لئے سامنے والے بڑے مال میں چلا گیا تھا۔ یوں ہی چیزیں دیکھتے دیکھتے ہی کوٹ مجھے پسند آ گیا۔ اس خیال سے خرید لیا کہ شاید آپ کو امریکہ کی سردی کا اندازہ نہیں ہوگا۔"

"لیکن یہ مجھے بالکل پورا آیا ہے۔ میرے سائز کا اندازہ کیسے ہوا......؟"

"اپنی آنکھوں کا یہ فہم ہم آپ پر منکشف نہ ہونے دیں گے۔"

وہ شرما کر چپ کر گئی۔

"سفر اچھا کٹ گیا......؟" وہ بات بدلنے کو بولے۔

"سفر تو سفر ہوتا ہے۔ مگر اس کی خوبی یہ ہے کہ کٹ جاتا ہے۔" وہ بولی۔

"خوب کہا...... سفر کا کٹ جانا ہی خوبی ہے۔"

موٹر بوسٹن کی بڑی بڑی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ فلک بوس عمارات، بڑے بڑے روشن روشن ڈیپارٹمنل سٹورز، ہوٹل، ریستوران، سائن بورڈ، بل بورڈ، فلمی تصویروں کی طرح ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔

وہ محویت سے باہر دیکھنے لگی۔

برف باری کہیں زیادہ محسوس ہوتی کہیں کم۔

مگر سڑکیں بالکل صاف تھیں۔

تسبیحہ کو یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی الف لیلوی لمحے میں اسیر ہوگئی ہے۔

امریکہ آنا...... عطار صاحب کی موٹر میں بیٹھ جانا...... کالا لمبا کوٹ پہن لینا...... ہلکی ہلکی برف کا گرنا...... جیسے اس نے یہ سب پچھلے جنم میں دیکھا تھا۔

موٹر جب چوراہے پر رُکتی۔ عطار صاحب اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ وہ بھی زیر لب مسکرا دیتی۔

ان کی بولتی ہوئی مسکراہٹ جیسے کچھ پوچھنا چاہتی۔ مگر وہ تو حیرتوں

کی ایک ڈگر پر آ گئی تھی۔

عمر کا وہ حصہ جب پھولوں بھرا دبستان، ہرے جنگل میں بدل جاتا ہے۔ سوائے آورش کے کوئی روش نظر نہیں آتی۔

تھکاوٹ چور کر دیتی ہے۔

وقت مجبور کر دیتا ہے۔

وہ عجیب احساسات سے گزر رہی تھی۔

کافی دیر کی پُراسرار خاموشی کے بعد عطار صاحب گویا ہوئے۔

”فی الحال میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ جب ہم گھر پہنچیں گے، کافی رات ہو چکی ہوگی۔ ویسے سوموار سے یونیورسٹی کھل جائے گی۔ آپ کی رہائش کا بندوبست یونیورسٹی کے ہوسٹل نمبر 1 میں ہے۔ یہ ہوسٹل ہم نے بطورِ خاص غیر ملکی مہمانوں کے لئے بنایا ہے۔ کل اور پرسوں چھٹی ہوگی۔ اگر آپ پسند کریں تو دو دن غریب خانے پر آرام کر لیجئے گا۔ سوموار کو میں آپ کو یونیورسٹی ہوسٹل میں پہنچا دوں گا۔“

”جی درست ہے۔“

وہ آہستہ سے بولی۔

”بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔“

”جی......! جہاز میں نیند نہیں آتی۔“

وہ بولی۔

”تو گویا آپ بیس بائیس گھنٹوں کی جاگی ہوئی ہیں......؟“

”بلکہ یوں کہئے دو راتوں کی جاگی ہوئی ہوں۔ سفر سے ایک رات

پہلے اینگزائٹی کی وجہ سے سو نہیں سکی۔“

”بری عادت ہے میری...... اپنے بستر اور اپنے تکئے سے مانوس نہیں ہونا چاہئے۔“

”اسی لئے جہاں جاتی ہوں تین چار دن مانوس ہونے میں لگ جاتے ہیں۔“

”کیا اچھی بات کی ہے آپ نے...... اکثر لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ اب اللہ کرے میرے گھر میں آپ کو ٹھیک طرح سے نیند آ جائے۔“

”برفباری کب سے ہو رہی ہے......؟“

اس نے بات ہی بدل دی۔

”پچھلے ہفتے شروع ہوئی تھی۔ اگلے ہفتے کی بھی پیشین گوئی ہے۔“

”پہلے میں نے سوچا تھا اس موسم میں آپ کو نہ بلواؤں۔ کہیں برف دیکھ کر آپ گھبرا نہ جائیں۔“

وہ بولے۔

”مگر کیا کروں......؟ مجھے یہ موسم بہت پسند ہے۔“

”مجھے بھی برفباری کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔“

وہ بولی۔

”میں جب آکسفورڈ میں تھی تو دوستوں کے ساتھ دُور دراز علاقوں میں سنوفال دیکھنے چلے جاتے تھے اور پھر یہاں تو اندر کا ماحول گرم ہوتا ہے۔ یہاں برفباری کام میں تو حائل نہیں ہوتی۔“

”میں ذرا شہر کے شور و شر سے دُور رہتا ہوں۔ شہر سے باہر ایک قسم

کا قصبہ ہے وہ...... اس لئے گھر جانے میں کچھ وقت لگ رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں عطار صاحب......! آپ بار بار معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہ کریں۔ مجھے تو محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ کہاں ہوں......؟ کیسی ہوں......؟"

وہ بے اختیار بولی۔

❀❀❀

ایک کشادہ سے گھر کے پورچ میں موٹر رُک گئی۔

عطار صاحب نے گاڑی بند کی۔ ریموٹ کنٹرول سے گھر کا مین دروازہ کھولا۔ دوسری طرف سے آ کر تسمیہ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ باہر نکل آئی۔ ڈگی سے اس کا سامان نکالا۔ پھر گاڑی کو بند کیا اور ہلکی روشنی کے بلب کی لو میں اندر کو قدم بڑھائے۔ تسمیہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ایک میکانکی انداز میں۔

انہوں نے لاؤنج کی ایک بتی جلا دی۔ سامنے بس سیڑھیاں نظر آئیں۔

پلٹ کر تسمیہ سے بولے۔

"آپ کا کمرہ اوپر ہے۔ میرے پیچھے پیچھے آ جائیں۔"

وہ جہاں سے گزرتے، ایک بتی جلا دیتے۔ وہ ایسے ان کی تقلید کر رہی تھی جیسے ازلوں سے ان کے پیچھے چل رہی ہو۔

اوپر پہنچ کر انہوں نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا اور ساری بتیاں جلا دیں۔

دیدہ زیب سجا سجایا کمرہ، بڑا خوب صورت چھپر کھٹ جیسے اسے کسی

نے چھوا تک نہ ہو۔

انہوں نے تسمیہ کا سوٹ کیس وارڈ روب کے نزدیک رکھ دیا اور پوچھا۔

"آپ کھانا کھائیں گی یا آرام کریں گی......؟"

"کھانا تو جہاز میں کھا لیا تھا میرا خیال ہے میں آرام کروں گی۔"

"آپ کے کمرے میں یہ منی فرج پڑا ہے۔ منرل واٹر کے علاوہ اس میں مشروبات بھی ہیں۔ یہ کافی پرکولیٹر ہے۔ باقی سامان میز پر پڑا ہے۔ جی چاہے تو تازہ کافی بنا کر پی سکتی ہیں۔"

انہوں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں اجازت چاہوں گا۔ یہ انٹرکام میرے بیڈ روم میں بجتا ہے۔ رات کو کسی شے کی ضرورت ہو یا کوئی بھی مسئلہ ہو، مجھ سے رابطہ کر لیجئے گا۔ میرے علاوہ اس گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔"

"بہت بہت شکریہ عطار صاحب......! بار بار شکریہ ادا کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر اس کے علاوہ اور کیا کہوں......؟"

"بہت وقت آئیں گے کہنے سننے کے...... اب آرام کیجئے...... صبح انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔ اچھا شب بخیر......!"

"شب بخیر......!"

تسمیہ نے بھی کہا۔

وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد اس نے دروازے کو اندر سے لاک کر لیا۔ سوٹ کیس کھول کے رات کے کپڑے نکالے۔ باتھ روم میں گئی۔ باتھ روم دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

منہ ہاتھ دھو کے کپڑے تبدیل کئے۔ سر میں اور جسم میں درد سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کافی کا ایک کپ بنایا۔ ایک پین کلر کھایا۔ اسے اکثر پین کلر ہی سے گہری نیند آ جاتی تھی۔

گرم گرم کافی پی کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔

کتنا آرام دہ بستر تھا۔

ماں کی آغوش کی طرح آسودگی بخشتا ہوا۔

جلد ہی وہ گہری نیند میں اُتر گئی۔

❁ ❁ ❁

پتہ نہیں کوئی گھنٹی بجا رہا تھا یا دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ عجیب سا شور تھا۔ وہ کسمسائی۔ کھینچ کے اپنے آپ کو گہری نیند سے نکالا۔ یوں لگا چلتی ٹرین کی کسی نے زنجیر کھینچ دی ہے۔ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں جھپک جھپک کر اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ ہے کہاں......؟

ایک دم اجنبی ماحول...... چاروں طرف نئی چیزیں...... جیسے ٹرین کسی سنسان سٹیشن پر ایک دم رُک گئی ہو۔

پھر اس نے اُٹھ کر جلدی سے بتی جلا دی۔

کمرہ روشن ہوگیا۔ نیند کھل گئی۔ دھیان مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی کی طرف چلا گیا۔ لپک کر انٹرکام اُٹھا لیا۔

''ہیلو......!''

''تسبیح......! میں عطار بول رہا ہوں۔''

''جی......! جی......!''

اس نے اپنی بھاری آواز میں جواب دیا۔

''آپ اچھی طرح جاگ گئی ہیں......

''جی جی......! اب جاگ گئی ہوں۔''

''آپ کو معلوم ہے آپ پچھلے بیس گھنٹوں سے سو رہی ہیں......؟ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔''

''بیس گھنٹے......؟''

تسبیح نے جھٹ اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ مگر اس پر تو ابھی تک پاکستانی وقت تھا۔

''میں فکرمند ہو رہا تھا۔ دو مرتبہ آپ کے کمرے تک گیا۔ آپ نے اندر سے کنڈی لگائی ہوئی تھی۔ اس خوف سے دروازہ نہ کھٹکھٹایا کہ کہیں آپ ڈر ہی نہ جائیں۔''

''اوہ......! اچھا اچھا......! نئی جگہ تھی نا...... اس لئے میں نے کنڈی لگا لی۔''

''اُف......! میں اتنی دیر تک سوتی رہی......؟ زندگی میں پہلی بار ہوا ایسا۔''

''میں چائے پر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''مجھے آدھا گھنٹہ دیجئے۔ میں فریش ہوکر آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے......!''

انہوں نے انٹرکام بند کر دیا۔

تسبیح نے کھڑے ہو کر ایک لمبی انگڑائی لی۔ کمرے کی ساری بتیاں جلا دیں۔ سوٹ کیس میں سے سارے کپڑے نکال کر ہینگروں میں لٹکا دیئے۔ پھر ایک جوڑا لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔

باتھ روم میں ضرورت کی ہر چیز پڑی تھی۔ شیمپو، کنڈیشنر، جیل، فیس

واش، صابن، باڈی لوشن اور بے شمار خوشبوئیں...... نیم گرم پانی سے غسل لیا۔ لمبے بال شیمپو کئے اور ڈرائیر سے خشک کر لئے۔ چہرے پر تھوڑی سی کولڈ کریم لگائی۔ اپنے اوپر اپنی دل پسند خوشبو چھڑک کے اس نے دوپٹہ اوڑھا اور سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگی۔

اس وقت اس کی ساری تھکاوٹ اُتر گئی تھی اور وہ پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں تھی۔

ایک سیڑھی...... دوسری...... تیسری......

دھیرے دھیرے...... رُک رُک کر...... قدم قدم وہ نیچے اتر رہی تھی۔

ایک احساس سا اس کے رگ و پے میں سرائت کرتا جا رہا تھا۔

آخری سیڑھی اُتر کر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔

مبہوت...... گم سم...... گنگ......

یہ لاؤنج تھا۔ خوشنما صوفے پڑے تھے۔ دلکش قالین بچھا تھا۔ چھت پر فانوس لٹک رہا تھا۔ آتش دان میں انگاروں کی شکل کا ہیٹر جل رہا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر تازہ گلاب کا گلدستہ پڑا تھا۔ دروازوں پر سبز بیلیں لپٹی ہوئی تھیں اور آتش دان کے پاس ایزی چیئر پر عطار صاحب چائے کا سامان کافی ٹیبل پر لگانے بیٹھے تھے۔ اوھ کھلی کتاب ان کی گود میں پڑی تھی جسے وہ پڑھتے پڑھتے اس کی آہٹ سن کر انہوں نے گود میں رکھ لیا تھا!

مگر وہ حیران و ششدر سیڑھیوں کے کونے میں کھڑی ایک ایک چیز کو تک رہی تھی۔

"تسبیح......!"

عطار صاحب نے عینک اُتار کر آواز دی۔

"رُک کیوں گئیں...... ؟ آؤ نا...... ! بتاؤ کیا بات ہے......؟"

اس نے اس طرح قدم اُٹھائے جیسے کسی نے اسے مسمرائز کر دیا ہو۔ جیسے کوئی اسے کھینچ کر چلا رہا ہو۔ چھت سے لے کر قالین تک ایک ایک چیز کو تکتی جا رہی تھی۔

پھر ہولے ہولے قدم اُٹھاتی آ کر عطار صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔

بت بنی ہوئی۔

پھر ان کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے تسبیح......؟"

عطار صاحب نے گھبرا کر مگر بڑی شفقت سے پوچھا۔

"کس بات نے تمہیں اس طرح حیران کر دیا ہے......؟"

"عطار صاحب...... ! جب میں آپ کو بتاؤں گی تو آپ مجھے پاگل تو نہ سمجھیں گے......؟ آپ میری بات کا یقین کر لیں گے......؟"

"کیوں نہیں...... ؟ تمہاری شخصیت ایسی نہیں کہ تم کچھ کہو اور اس میں شک و شبے کی گنجائش ہو۔ بے دھڑک کہو...... جو کہنا ہے کہو......!"

وہ ملائمت سے بولے۔

"عطار صاحب......!

میں آپ کو کیا بتاؤں...... ؟ اور کیسے بتاؤں...... ؟ آپ یقین کریں۔ میں نے یہ گھر پہلے بھی دیکھا ہے۔ کئی بار...... کہاں...... ؟ کب...... ؟ کیسے...... بتا نہیں سکتی۔ خواب میں یا خیال میں...... ؟ جاگتے میں یا سوتے میں...... ؟ کچھ

کہہ نہیں سکتی۔"

"بخدا یہی گھر تھا...... بالکل ایسا...... اسی طرح کا ماحول...... یہی صوفے...... یہی چھت...... ایسا ہی فانوس...... اور ایک شخص دیوتاؤں جیسا...... آتش دان کے پاس بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔

وہ پتہ نہیں کون تھا......؟ چہرہ کبھی صاف نظر نہیں آیا۔

میں جب چھوٹی سی تھی۔ اکثر یہ خواب دیکھتی تھی۔ صبح اُٹھ کے اپنے ابو جی کو اس گھر کے بارے میں بتاتی تھی۔ ابو جی کہتے تھے، عمارت دیکھنا اچھی بات ہے۔ تمہیں علم وعرفان کی طرف اشارہ دیا جا رہا ہے۔ تم نے زندگی کسی نیک مشن میں گزارنی ہے۔

جب تک ابو جی زندہ رہے، میں یہ خواب دیکھتی رہی۔ بلکہ سونے سے پہلے بعض اوقات اپنی Will Pover کے ذریعے اس میں پہنچ جایا کرتی تھی۔

ابو جی کی وفات کے بعد میں اس قدر روئی کہ یہ گھر میرے آنسوؤں میں کہیں بہہ گیا۔ یا میں وقت کے گرداب میں اس طرح پھنس گئی کہ ساری ترجیحات ہی بدل گئیں۔

قسم ہے ابو جی کی عطار صاحب......! میں نے اس گھر میں اسی طرح آپ جیسے ایک شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ آپ تھے کہ کون تھا وہ...... پر کوئی تھا آپ جیسا ہی۔

عطار صاحب......! قدرت میرے ساتھ یہ مذاق کیوں کرتی رہی......؟ اور اب اس عمر میں...... اس عمر میں مجھے اس گھر میں لا کھڑا کیا۔

یہ مذاق نہیں تو کیا ہے......؟"

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

عطار صاحب بس خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ جذبات کے اس سنگم پر کچھ کہنا فضول تھا۔ شیشے کی دیوار کے ٹوٹ جانے کا ڈر تھا۔

وہ خود بھی ایک ماورائی مخلوق کی طرح چلتی ہوئی ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔ روتے روتے اس نے سر اُٹھایا اور بولی۔

"عطار صاحب......! میں آپ کے گھر کو دیکھے بنا بتا سکتی ہوں۔ اس طرف دو بیڈ روم ہیں۔ دائیں طرف ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم ہے۔ اس طرف ایک کچن ہے۔ ٹی وی لاؤنج کے اندر ایک لائبریری ہے۔ پیچھے ایک بڑا لان ہے۔ ایک سوئمنگ پول ہے۔ ساتھ باربی کیو ریزارٹ (Resort) بنا ہوا ہے۔

عطار صاحب......! پلیز بتائیں، میں نے ٹھیک بتایا کہ غلط......؟"

"بالکل درست ہے۔"

وہ بولے۔

"میں صبح ہوتے ہی یہ سب چیزیں آپ کو دکھاؤں گا۔"

"میں بچپن میں اس گھر کے اندر باہر کھیلتی رہی ہوں۔ میرے خواب اس گھر کے گرد گھومتے ہیں۔ کیوں......؟ جبکہ یہ گھر میرے مقدر میں نہیں تھا۔ اب جبکہ میں ساٹھ سال کی ہو چکی ہوں، تقدیر مجھے اس گھر میں لے آئی۔ زندگی قریب الاختتام ہے۔ میں اپنی عمر کی پونجی لٹا چکی ہوں۔ یہ قدرت کا مذاق نہیں...... کیوں......؟ کیوں......؟"

وہ پھر رونے لگی۔

عطار صاحب نے کافی بنائی اور پیالی اس کی طرف بڑھا کر بولے۔

''پہلے یہ کافی پی لیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھالیں۔ میں بھی آپ کو بڑی اچھی اچھی باتیں بتاؤں گا۔''

اس نے کافی کی پیالی پکڑ لی۔ باقاعدہ آنسوؤں سے روتی رہی اور گھونٹ گھونٹ کافی پیتی رہی۔ اس کے گرم گرم آنسو بھاپ دیتی کافی میں بھی گرتے رہے۔

اتنے میں اس کا موبائل بج اُٹھا۔

اُٹھایا تو دوسری طرف درمان تھا۔

''ماما......! میں بارہ بجے دن سے فون کر رہا ہوں۔ آپ اُٹھاتی کیوں نہیں......؟''

تسمیہ نے جلدی جلدی اپنی آواز پر قابو پایا اور اسے بتایا کہ وہ تقریباً بیس گھنٹے گھوڑے بیچ کر سوتی رہی ہے۔ گھر سے ہی تھک کر نکلی تھی۔

اب جاگی ہے اور عطار صاحب کے ساتھ کافی پی رہی ہے۔

پھر اس نے اپنا سوموار کا پروگرام اسے بتایا اور دو چار ضروری باتیں پوچھ کر فون بند کر دیا۔

''آپ کچھ کھائیں گی......؟''

عطار صاحب نے پوچھا۔

''آپ کل سے بھوکی ہیں۔''

''مجھے اس کا احساس ہی نہیں عطار صاحب......! میں رات اس بستر

میں ایسی سوئی ہوں جیسے کسی نے منتر پھونک دیا ہو۔ ایک عرصے بعد مجھے ایسی نیند آئی ہے۔ اس نیند کو میں ترس گئی تھی۔''

میرا خیال ہے پہلے آپ تھوڑا سا کھانا کھا لیں...... وہ سامنے میز پر رکھا ہے۔ پھر میں نے آپ کے ساتھ ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنی ہیں۔''

''کھانا کس نے بنایا ہے......؟''

تسمیہ نے پوچھا۔

''خود میں نے......!''

وہ بولے۔

''آپ نے......؟ آپ نے......؟''

وہ حیرت سے بولی۔

''بات یہ ہے کہ میرے گھر ایک لبنانی میڈ آتی ہے۔ وہ ہفتہ اتوار دو دن چھٹی کرتی ہے۔ دو دنوں کے لئے کھانا پکا کے رکھ جاتی ہے۔ میں نے تو صرف گرم کر کے میز پر لگا دیا ہے۔''

''عطار صاحب......! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ آپ چھوٹے چھوٹے کام نہ کیا کریں۔''

''کیا چھوٹے کام کرنے سے آدمی چھوٹا ہو جاتا ہے......؟''

''نہیں......! اس طرح کے چھوٹے کام ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے لئے رہنے دیا کریں۔''

وہ اُٹھ کر کھانے کی میز پر چلی گئی۔

دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔

پھر دونوں آ کر آتش دان کے قریب بیٹھ گئے۔

''تسبیح......! آپ کے ابو نے کیا خوب آپ کا نام رکھا۔''

''مگر ابو جی کو معلوم نہیں تھا تسبیح کے دانے بکھر جاتے ہیں۔''

''تسبیح کے دانے بکھر کر بھی تسبیح کے دانے ہی کہلاتے ہیں۔ ان پر کسی سچے یا جھوٹے موتی کی چھاپ نہیں لگتی۔ معلوم ہے آپ کو......؟''

انہوں نے اس کی روئی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! تو آپ نے مجھ سے باتیں کرنا تھیں۔''

وہ جلدی سے بات بدل کر بولی۔

''ہاں......!''

انہوں نے اُٹھ کر تیز بتیاں بجھا دیں۔ ہلکا بلب جلنے دیا۔ فانوس بھی بجھا دیا۔ ماحول خواب ناک ہوگیا۔ اُٹھ کر انہوں نے ہلکی ہلکی ستار کی دھن والی سی ڈی لگا دی۔

مسکرا کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''تم یقین کرو یا نہیں...... اب تمہاری مرضی......!''

❀ ❀ ❀

میں پاکستان کے ایک گاؤں سے نکل کر شہر میں آیا تھا۔ اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے شہر کو فتح کیا پھر امریکہ آ گیا۔ ہاورڈ یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ یوں معاش اور معیشت کی منزلیں طے کرتا کرتا ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ محنت اور لگن میرے ساتھی تھے۔ اس کے علاوہ ربیکا (Rebecca) ربیکا بھی۔

ربیکا ہاورڈ یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھی۔ وہ ہمیشہ ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اس نے ہر حالت میں ساتھ نبھانے کا عندیہ دیا تھا۔ شروعات اس کی طرف سے ہوئیں۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی بڑی ہی متوازن طبیعت کی عورت تھی۔ پھر میں بھی مائل ہوگیا۔

میری ماں نے بچپن میں میری بات اپنی ایک یتیم بھتیجی سے پکی کر دی تھی۔ وہاں شادی نہ کر کے میں نے بس ایک ہی بار اپنی ماں کی حکم عدولی کی تھی۔ ورنہ میں اپنی ماں کو ہی اپنا قبلہ و کعبہ سمجھتا تھا۔

شادی کے بعد ہم نے دنیا بھر کی سیر کی۔ جہاں بھی جاتے لوگ ہمیں حیرت اور مسرت سے دیکھا کرتے۔ ہر کوئی یہی کہتا۔ اتنا موزوں اور شاندار جوڑا کروڑوں میں ایک آدھ ہوتا ہے۔ ہم بازار میں جاتے تو لوگ ہمیں مُڑ مُڑ کر دیکھتے۔ بعض تو آ کر خراج بھی پیش کر جاتے۔

ربیکا جسے میں پیار سے ردب کہا کرتا تھا۔ اس بات پر بہت اتراتی تھی۔ کہتی تھی قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے۔

شادی کے پانچ سال بعد ہماری بیٹی پیدا ہوئی۔ بدقسمتی سے وہ پیدائشی معذور تھی۔ ذہنی طور پر مفلوج۔

میں نے اس کا نام حلیمہ سعدیہ رکھا تھا۔ اوپر والا بیڈ روم تمام تر رہائشی آلائشوں کے ساتھ اس کے لئے بنایا تھا۔

جوں جوں بڑی ہوتی گئی لوتھ بنتی گئی۔ ہم نے اس کے علاج پر پانی کی طرح روپیہ بہا دیا۔ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ وہ نہ بولتی، نہ سنتی، نہ چلتی، بس لوتھڑے کی صورت میں بڑی ہوتی جاتی۔ اس کے لئے ہمہ وقت ایک نرس کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کیونکہ ہم دونوں میاں بیوی کام کرتے تھے۔ اور بچی کا دُکھ ایک دوسرے پر ظاہر نہ کرتے تھے۔

اس سے زیادہ تکلیف وہ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے دوسرا بچہ پیدا کرنے کے لئے مختلف قسم کے ٹیسٹ کرائے تو ڈاکٹروں نے ہمیں متنبہ کر دیا کہ ہم کبھی نارمل اور صحت مند بچہ پیدا کرنے کے قابل نہ ہوسکیں گے۔ اس لئے ہمیں کوشش اور خواہش نہیں کرنی چاہئے۔

یہ نہیں کہ ہم صبر کر کے بیٹھ گئے۔

مشرق و مغرب میں جہاں ہمیں شنید ملتی، علاج کے لئے پہنچ جاتے۔

مگر قدرت کا فیصلہ ہمیں سنا دیا جاتا۔

دس سال بعد ہمیں صبر آ گیا۔

ہمیں دُنیا آئیڈیل جوڑا کہتی تھی اور کہتے تھے قدرت نے خاص

پلاننگ کر کے آپ دونوں کو ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے۔

تو کیا اس خوش نصیبی کی کوئی قیمت نہ تھی۔

حسن، دولت، محبت، اچھی شہرت، صحت مند زندگی، زندگی کے سارے وسائل۔

سب کچھ تھا۔ ایک نارمل بچے کی کمی تھی۔

قدرت کے فیصلے تو قبول کرنے پڑتے ہیں۔

مگر ردب کو چین نہیں آتا تھا۔

کبھی کبھی مجھے کہتی۔

''عاطی......! تم دوسری شادی کر لو۔ تمہارے مذہب میں تو اجازت ہے کہ مرد ایسی صورت میں دوسری شادی کر سکتے ہیں۔''

''اور دوسری شادی میں سے بھی ایسے ہی بچے ہوئے تو...... کسی بات کی گارنٹی تو ہے نہیں۔''

کبھی کبھی میں بھی بڑی محبت سے کہتا۔

''ردب......! تم مجھے چھوڑ دو اور کسی دوسرے مرد سے شادی کر لو۔ شاید تمہیں نارمل بچہ نصیب ہو جائے۔ تمہاری ممتا کی تکمیل ہو جائے۔ تمہارا اُدھورا پن دُور ہو جائے۔''

تو وہ چیخ کر کہتی۔

''بچے کی خاطر تمہیں چھوڑ دوں......؟ تمہیں تو میں صرف مر کر ہی چھوڑوں گی۔ بچے کے لئے اپنی محبت قربان نہیں کر سکتی۔ اگر تم دوسری شادی کر لو تو سوتن کو گوارا کر لوں گی۔ مگر تم سے علیحدگی جیتے جی ممکن نہیں۔ ایک زہر

کی پڑیا مجھے دے دو۔ پھر نجات حاصل کر لو۔"

ہم ایک دوسرے کی نظر میں سرخرو ہونے کے لئے ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے رہتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ مجھے احساس دلاتی کہ تم نے اپنی ماں کا کہا نہ مان کر یہ سزا پائی ہے۔ پھر کہتی۔

"عاطی......! اب بھی جاؤ۔ اس لڑکی سے شادی کر لو۔ جو تمہارے لئے اب بھی ماں کے پاس بیٹھی ہے۔"

میری ماں کی بھتیجی خیر النساء ماں کے پاس ہی رہتی تھی۔ میرے انکار کے بعد وہ کسی اور سے شادی پر رضامند نہیں ہوئی تھی۔ میرا ایک چھوٹا بھائی جو اکثر بیمار رہتا تھا، ماں نے مرنے سے پہلے خیر النساء کی شادی غفار سے کر دی تھی۔ جب ماں دُنیا میں نہ رہی اور خیر النساء کی بھی شادی ہوگئی تو پھر روب نے یہ بات کہنا بھی بند کر دی۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔

لندن میں تیسری دُنیا کے مسائل سے متعلق ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا۔ میں اور ربیکا دونوں شامل ہوئے۔

وہاں میں نے ایک خوب صورت عورت کو بڑے وقار اور خود اعتمادی کے ساتھ ایک پُر مغز مقالہ پڑھتے ہوئے سنا۔ اس کے دلائل سن کر دنگ رہ گیا۔ جب وہ عورت سامعین پر ایک سحر سا طاری کر کے سٹیج سے اُتر گئی تو میں نے بے اختیار ربیکا سے کہا۔

"روب......! مجھے اس عورت سے فرسٹ سائیٹ لو ہوگئی ہے۔ پہلی

نظر میں وہ میرا دل لوٹ کر لے گئی ہے۔"

وہ بولی۔

"چلو تمہیں اس سے ملاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"وہاں پر ایسی ویسی بات نہ کرنا۔ پاکستانی عورتیں اور طرح کی ہوتی ہیں۔"

وہی مجھے کھینچ کر تمہارے پاس لے گئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ کچھ دوستانہ ماحول ہو جائے گا۔ جب تم نے ہم دونوں کو خاص اہمیت نہیں دی تو ہم نے دوبارہ تمہیں ملنے کی کوشش نہیں کی۔

(یہاں پر بت بنی بیٹھی ہوئی تسبیحہ پہلی بار مسکرائی)۔

یہ قصہ ختم نہیں ہوگیا تسبیح..

اس کے بعد بھی ہمارے گھر میں تمہارا تذکرہ رہا۔ جب کبھی ہمارے درمیان کوئی بدمزگی ہوتی اور میں اس سے روٹھ جاتا تو وہ آ کر کہتی۔

"عاطی......! تمہیں اس عورت کی قسم، جس سے تمہیں پہلی نظر میں محبت ہوگئی تھی۔ اب مان جاؤ......!"

تو میں اس کی اس بچگانہ ادا پر ہنس پڑتا۔

"روب......! تم کتنی احمق ہو۔ ایک بے کار سا خیال ذہن میں اُٹھائے پھرتی ہو۔ پتہ نہیں وہ عورت کون تھی......؟ کہاں گئی......؟ مجھے تو اس کے بعد اس کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔"

"عاطی......! میں جانتی ہوں۔ کئی پاکستانی مردوں سے مل چکی ہوں۔

وہ چاہے کسی بھی ملک میں شادی کر لیں، ان کا آئیڈیل ان کے وطن کی عورت ہی ہوتی ہے۔"

"میرے لئے تم ہی آئیڈیل ہو روب......! ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"

کبھی کبھی جب وہ میری کسی بات سے بہت خوش ہو جاتی تو فوراً کہتی۔

"اللہ کرے تمہیں وہ عورت مل جائے جس سے تمہیں پہلی نظر میں محبت ہوگئی تھی۔"

شاید اس کے دل میں یہ خلش تھی کہ میں نے اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ مجھے اس سے پہلی نظر میں محبت ہوگئی تھی۔ شاید ان دنوں میں بڑا خودپسند تھا۔ اس نے اپنے طرزِ عمل سے آہستہ آہستہ مجھے جیتا تھا۔ اگرچہ میں نے اس کے ساتھ شادی کرنے کے بعد کبھی شوہرانہ بددیانتی نہیں کی تھی۔

پھر بھی ہمارے گھر میں تمہارا برسوں ذکر رہا۔ جبکہ تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا۔

اس ذکر میں نہ رشک تھا نہ حسد...... نہ کوئی انتقامی جذبہ۔

ہم اپنی زندگی کی بہت بڑی محرومی کو...... ایسی گلابی گلابی باتوں سے بہلانے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔

میں تو خیر مرد ہوں۔ سہہ گیا تھا۔

مگر وہ عورت ذات تھی۔ یہ دُکھ اس کے کلیجے میں بیٹھ گیا تھا۔

اندر ہی اندر اس کے حسن کو گھنانے لگا تھا۔ دیمک کی طرح اسے چاٹنے لگا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں نے بیٹھ کے طے کیا کہ دنیوی خواہشوں

سے بالا ہو کر انسانیت کے لئے کوئی بڑا کام کیا جائے۔

تب ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ہاورڈ یونیورسٹی کی طرز کی ایک بین الاقوامی درس گاہ بنائیں۔ جس کا مقصد مسلم اُمہ کی نوعمر نسلوں کو مغرب کی بے راہ روی سے بچانا اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے تیار کرنا ہو۔

جب ہم اپنی یونیورسٹی کے لئے کام کر رہے تھے انہی دنوں نائن الیون کا حادثہ ہوگیا۔

بعد میں جو حالات پیدا ہوئے انہوں نے ہمیں اپنا کام تیز تر بنیادوں پر کرنے میں مدد دی۔

ریبکا کو اپنے والد کی طرف سے کئی ایکٹر زمین بوسٹن کے نواح میں مل گئی تھی۔ وہ زمین اس نے یونیورسٹی کے لئے Donate کر دی۔ جس پر ہم نے اسلامی طرزِ تعمیر کی ایک عمارت تعمیر کرنی شروع کر دی اور خود اسلامی ملکوں میں جا کر وہاں سے اساتذہ اور دانشور اکٹھے کرنے کے منصب پر روانہ ہوگئے۔

ملکوں ملکوں، حالات کا جائزہ لیتے۔ انٹرویو کرتے۔ ہم خیال لوگ اکٹھے کرنے میں ہم اتنے مصروف ہوگئے کہ حلیمہ سعدیہ کی طرف دھیان نہ دے سکے۔

چونکہ ایک نرس اور ایک ڈاکٹر اس کے لئے مقرر تھے، اور وہی اس کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے، اس لئے ہم ذرا سے بے پرواہ ہوگئے تھے۔

جب ہم ٹور ختم کر کے واپس آ رہے تھے تو ہمیں اطلاع ملی کہ حلیمہ کی طبیعت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ اسے ہسپتال منتقل کرنا پڑ گیا ہے۔

ہم دوڑے دوڑے ہسپتال گئے۔ وہ بچوں کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد ہماری گیارہ سالہ معذور اور بے زبان بچی ہمیں داغ مفارقت دے گئی۔ ربیکا بہت روئی۔ کہتی تھی۔

''حلیمہ کے ہونے سے وہ صاحب اولاد تھی۔ اب اس کی کبھی اولاد نہ ہوگی۔''

میں اسے تسلیاں دیا کرتا تھا کہ یہ حلیمہ کے حق میں بہت اچھا ہوا۔ وہ جوان ہو جاتی تو ہمارے بعد اس کا کون سہارا ہوتا......؟

مگر اس کے دل کو چین نہیں آتا تھا۔

سارا سارا دن حلیمہ کے کمرے میں لیٹی اس کے تکیوں کو سینے سے لپٹا کر روتی رہتی۔ اس کے کھلونے چومتی رہتی۔ جو کبھی اس بچی نے اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے تھے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ

''ہم جو تعلیمی درس گاہ بنا رہے ہیں۔ اس میں ہر سال ہزاروں لڑکے اور ہزاروں لڑکیاں کامیاب ہو کر نکلا کریں گے۔ وہ سب ہماری اولادیں ہی ہوں گی۔''

اور پھر اسے صبر آ گیا۔ مگر اندر ہی اندر وہ چپکے چپکے گھلنے لگی۔ جیسے بتاشہ گرم پانی میں گھل جاتا ہے۔ یا برف کی سل تندور پر رکھیں تو پانی ہو جاتی ہے۔

پھر وہ دن آ گیا...... بن چاپ کے......

جس کا میں نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔

پتہ نہیں دو انسان جو ہر دم ساتھ دینے کی قسمیں کھا کر ایک دوسرے

کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ اس ڈگر پر ہمیشہ اکٹھے کیوں نہیں رہ سکتے......؟ ایک کو ہمیشہ ہاتھ چھڑا کر پہلے جانا پڑتا ہے اور دوسرا باقی ساری زندگی تنہائی کا زہر پیتا ہے۔

اس کی اچانک موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

مرتے وقت اس نے مجھے بتایا کہ اسے کینسر تھا۔ جسے اس نے سالوں چھپائے رکھا۔

وہ مجھے نئی زندگی کے لئے آزاد چھوڑ کے جانا چاہتی تھی۔

''کیا تمہارے بعد میں نئی زندگی شروع کرنے کے قابل ہو سکوں گا......؟''

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''تقدیر نے تو ہم دونوں کے ساتھ مذاق کیا ہے۔''

وہ ہنسنے لگی۔ کہنے لگی۔

''عاطی......! تم پاکستان جا کر اس عورت کو ڈھونڈنا جس نے پہلی نظر میں تمہارا دل لوٹ لیا تھا۔ پھر اس سے شادی کر لینا۔''

کیونکہ میں بھی ہنسی ہنسی میں اس سے یہ بات کئی بار کہہ چکا تھا کہ اگر میری جوانی میں ایسی عورت مجھے پاکستان میں نظر آ جاتی تو میں اس سے ضرور شادی کر لیتا۔ افسوس ایسی عورتیں میرے آنے کے بعد نمودار ہوئیں۔

مرتے وقت اس کو میری یہ بات یاد آ گئی۔ وہ کتنی حساس تھی، اس نے ہر بات دل میں چھپا کے رکھ لی تھی۔

میں رونے لگا۔ میں نے کہا۔

"پاگل عورت......! یہ بات تو میں نے تیس سال پہلے کہی تھی۔ جبکہ میں 35 برس کا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ عورت ابھی تک جوان ہوگی......؟ اور کنواری بیٹھی ہوگی......؟"

"اچھا......!"

اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"میں جاتے ہی جیسس سے سفارش کروں گی اور التجا بھی کہ وہ جیسی بھی ہو تمہیں مل جائے۔ اور تم بھی مجھ سے وعدہ کرو۔ اگر وہ تمہیں مل گئی تو تم اس سے ضرور شادی کر لو گے۔"

"روب......! بچوں والی ضد نہ کرو۔ اگر وہ شادی شدہ بال بچوں دار ہوئی تو میں اسے کیا کروں گا......؟"

"تم اس کے شوہر کو میری وصیت کا بتانا اور کہنا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ پھر تم شادی کر لینا۔"

میں روتے روتے ہنس پڑا۔

"کیسی انہونی باتیں کر رہی ہو......؟ بھلا ایسی شادی سے فائدہ بھی کیا ہوگا......؟"

وہ بولی۔

"میں نہیں جانتی۔ بس اسے میری وصیت سمجھو۔ وہ ضرور ملے گی تمہیں اور تم اس سے ضرور شادی کر لو گے۔ وعدہ کرو......! ورنہ میرا دم نہیں نکلے گا۔"

میں نے اس کی تسلی کے لئے جھوٹ موٹ وعدہ کر لیا۔ تو وہ سچ مچ

چلی گئی۔"

یکا یک عطار صاحب ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے۔

تسبیحہ جو ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

عطار صاحب نے تسبیحہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ان پر اپنی آنکھیں رکھ دیں اور روتے رہے۔ اس کے ہاتھوں کو بھگوتے رہے۔ ہچکیاں تیز تر ہوتی رہیں۔

تسبیحہ کو معلوم تھا۔ جب یادوں کے جھکڑ چلتے ہیں تب درد کی آندھیاں اُٹھتی ہیں۔ پھر ان آندھیوں کے جلو میں بادل برستے ہیں۔ خوب گھن گرج کے ساتھ۔

برسات کا اپنا زور جب تک ختم نہ ہو۔ بھلا اسے کیسے روکا جائے۔ ان کی حالت دیکھ کر اس کا اپنا دل آنسو بن کر بہہ جانا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب آنسوؤں کا زور ٹوٹا تو اس نے پیار سے ان کا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور اپنے دوپٹے سے ان کے آنسو صاف کئے۔

وہ اپنی گلوگیر آواز میں بولے۔

❁❁❁

"تسبیح......! یہ سب مافوق الفطرت باتیں ہیں۔ ناقابل یقین...... مگر حیران کر دینے والی...... مگر ایک وقت آتا ہے جب ان پر یقین کرنا پڑتا ہے۔

میں آج تمہارے سامنے حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میں نے اپنی گزشتہ تنہا زندگی کے کئی سالوں میں تمہیں اس گھر کے اندر چلتے پھرتے دیکھا ہے۔

اسی حلیے میں...... اسی صورت میں...... جیسے تم آج میرے سامنے بیٹھی ہو۔ تمہیں ہولے ہولے سیڑھیاں اُتر کر سامنے چپ چاپ کھڑے ہوئے دیکھا ہے۔ جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے تم وہاں کھڑی ہوگئی تھیں۔

کھانا چنتے ہوئے...... میز لگاتے ہوئے...... باتیں کرتے ہوئے...... ہوا کی طرح ادھر سے ادھر جاتے ہوئے...... بند آنکھوں سے بھی اور کھلی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے۔

جب میں نے پاکستان میں اسامیوں کے لئے اشتہار دیا تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ تم ان لوگوں میں آجاؤ گی۔

اور پھر جب تم ان لوگوں میں آکر بیٹھ گئیں تو مجھے اپنی آنکھوں پر اور اپنے واہموں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے تمہاری تقریر سن کر تمہیں پہچان لیا تھا۔ اور پھر جب تم سے

طویل انٹرویو ہوا تو میرے دل نے تمہیں مان لیا تھا۔

دو سال تک میں بس تمہیں دیکھتا رہا ہوں۔ تمہیں سنتا رہا ہوں۔ حوصلہ نہیں ہو رہا تھا تمہیں یہاں تک لانے کا۔

اور اب...... میں تمہیں دانستہ اپنے گھر لایا تھا۔ یونیورسٹی والوں سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ائیرپورٹ نہ جائیں۔

میں تمہیں اس گھر کے اندر سچ مچ چلتا پھرتا دیکھنا چاہتا تھا کہ تم وہی ہو۔ اپنے گمان کو یقین میں بدلنا چاہتا تھا۔

ابھی جب تم نے بتایا کہ تم بچپن میں یہ گھر دیکھتی رہی ہو...... ایک میرے جیسا شخص آتش دان کے قریب بیٹھا ہوا بھی......

وہ شخص تمہیں بھی اپنے گھر میں دیکھ رہا تھا۔

مجھے یونیورس پر بہت پیار آیا۔ تمنا میں صداقت ہو تو سارا یونیورس تعاون کرنے لگتا ہے۔ حالات اور واقعات فراہم کرنے لگتا ہے۔

کوئی ناطہ میرے اور تمہارے درمیان قدرت نے رکھا تھا۔ گنجائش بھی رکھی تھی۔ بالآخر تم اس گھر میں اس وقت پہنچ گئیں. جب اس گھر میں رہنے کے لئے تمہارے راستے صاف ہیں۔

اور میں نے اس جادوئی رات میں تمہیں اپنے گھر میں دیکھ لیا۔

یہ دُنیا ہے۔ اس کی پٹاری واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اسی دُنیا میں محیر العقول واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جو ہمیں ہماری نامعلوم اور ان دیکھی منزل کا پتہ دیتے ہیں۔

میرا مذہب دوسرے جنم پر یقین رکھنے کو منع کرتا ہے۔ مگر زماں د

مکاں کے اسرار سے پردہ بھی نہیں اُٹھاتا۔

کوئی شے ہے جو وقت سے آگے پیچھے ہو جاتی ہے۔

کوئی بھول وقت سے بھی ہو جاتی ہے۔

کچھ چیزیں لیل و نہار کی گردش میں پھنس بھی جاتی ہیں۔

بندہ جلد باز ہے اور اس کے پاس نگاہ بھی نہیں ہوتی۔''

رات آہستہ آہستہ ڈھلتی جا رہی تھی۔

برف کی نقرئی کلیاں رات کی جھولی میں گرتی جا رہی تھیں۔

برف کی چھوٹی چھوٹی پھواریں باہر والے شیشے کے دروازے کو بھی لپٹتی جا رہی تھیں۔

کمرہ نیم روشن تھا۔

صرف ہیٹر کی آگ ماحول کو دہکا رہی تھی۔

جیسے یہ کوئی الوہی نغمہ ہو۔ جادو کی الف لیلوی پری نے ابھی ابھی ماحول پر کوئی عمل چھڑک کے اسے منجمد کر دیا ہو۔

دُور دُور قافلے کی گھنٹیوں کی سی آواز وال کلاک سے نکل کر ساری فضا کو رومانوی موسیقی عطا کر رہی تھی۔

دُنیا ایک طرف رہ گئی تھی اور دُنیا کے دو بندے اپنی ہی دُنیا میں پہنچ گئے تھے۔

تسمیہ بے چینی کے مارے کھڑی ہو گئی۔

پھر شیشے کے دروازے کے ساتھ اپنے سلگتے ہوئے گرم رُخسار کو لگا کر گویا برف کی سرگوشی سننے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کی اس حرکت نے دروازے کے شیشے پر اس کی سانسوں سے ایک شبیہ بنا دی۔ وہ سارے لاؤنج کا چکر لگا کے پھر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''عطار......! آؤ تم یہاں میرے ساتھ میرے صوفے پر بیٹھ جاؤ...... میں بھی تمہیں اس پاگل دل کی ڈھکی چھپی بات بتا دوں۔ اپنی کہانی سنا دوں۔''

''سنو......! اگر میں کہیں رو پڑوں تو مجھے چپ مت کرانا۔ روانی رُک جائے گی۔''

عطار صاحب اُٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھے۔

❁ ❁ ❁

"تیس پینتیس برس پہلے کے جس واقعے کا تم نے ذکر کیا ہے۔

میرے ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ تھا۔ ابھی میں نے کھڑکی کھولی تو نمودار ہوگیا۔

ہاں مجھے یاد ہے۔تم اپنی بیوی کے ہمراہ مجھے مبارک باد دینے آئے تھے۔ میں نے نظر بھر کر تمہیں دیکھا تو میری نظر واپس آنا بھول گئی۔ اتنا خوبرو اور خوش ادا مرد میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

اگلے لمحے تمہاری بیوی پر نظر پڑ گئی۔ وہ بھی اتنی ہی حسین...... سبحان اللہ...... میں تم دونوں کا شکریہ ادا کرنا بھول گئی۔ بات کرنا بھول گئی۔ بار بار سوچتی۔

"کیا ایسے مرد پاکستان میں تھے...... تو مجھے کیوں نہ مل سکے......؟"

اس پورے سیمینار میں، میں نے اکثر تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھا اور ہر بار نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

ایک شام جب تم پائن ہوٹل کی لابی سے اپنی بیوی کے بازو میں بازو ڈالے گزر رہے تھے تو میں نے دونوں کو دیکھ کر پتہ ہے کیا کہا تھا......؟"

وہ رُک گئی۔

"میں نے کہا تھا۔

"باری تعالیٰ......! جوڑیاں ملانے کے لئے کہاں کے بندے کہاں لا ملاتا ہے......؟"

میرے ساتھ ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔

اور یہ وہ شخص تھا جو بعد میں بلاشرکتِ غیرے میری زندگی کا مالک بن بیٹھا تھا۔ بغیر کسی جذباتی لگاؤ اور ذاتی تعلق کے۔

جیسے تم نے ابھی کہا ہے۔ اس وقت قدرت دوسرا مہرہ چل رہی تھی۔"

تھوڑا سا توقف کر کے اس نے اپنی ازدواجی زندگی کی کرب ناک کہانی پوری کی پوری اسے سنا دی۔

وہ روتی رہی...... اور بولتی رہی...... ہچکیاں لیتی رہی...... اور کہانی سناتی رہی۔

"عطار......! میں بہت دُور نکل گئی تھی۔ جب واپس آئی تو تین بچوں کے سوا میرے دامن میں کچھ نہیں تھا۔

میں نے انہیں قدرت کا انعام سمجھ کر کلیجے میں سنبھال لیا۔ ان کی پرورش میں لگ گئی۔

زندگی کو اس طرح اپنے اوپر اوڑھ لیا کہ ماضی بعید کے کسی ہیولے کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ جو کبھی میرے وجدان سے ٹکرایا تھا۔

سوچیں ہی تبدیل ہوگئی تھیں۔

زندگی اس گپھا میں جا کے پھنس گئی تھی جہاں صرف دن رات اور روٹی کمانے کا چکر تھا۔

تاوقتیکہ تمہارے ادارے کا اشتہار دیکھا...... ارادہ باندھا...... انٹرویو کے لئے آئی۔

تم نے سیمینار والا زمانہ یاد دلایا تو یوں لگا کسی نے سوئی ہوئی زندگی پر آبِ حیات چھڑکنا شروع کر دیا ہے۔

تمہارے ساتھ کام کرتے ہوئے میں زندہ ہونے لگی۔ ساری توانائیاں بحال ہونے لگیں۔

معلوم نہیں تم میں کیا بات تھی...... عمر کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر پار کر کے تم میرے پاس پہنچے تھے۔ عمر کا اِک لق و دق صحرا میں بھی عبور کئے بیٹھی تھی۔

اس عمر میں از خود آرزوؤں کے سارے چراغ ایک ایک کر کے بجھ جاتے ہیں۔ مسافر کے پاس تو زادِ راہ تک نہیں رہتا۔

ان پچھلے دو سالوں میں کبھی کبھی میرا جی ایک چور سا سپنا دیکھا کرتا کہ کوئی رات ہو زماں و مکاں سے الگ...... جس رات میں تمہارے کاندھے پر سر رکھ کر اتنا رو لوں کہ پھر بقایا زندگی رونے کی حسرت رہے نہ ضرورت۔"

وہ واقعی دوبارہ رونے لگی۔

عطار صاحب نے رسان سے اس کا سر اپنے کاندھے پر ٹکا لیا اور آہستہ آہستہ اس کے سر کو سہلانے لگے۔

وہ یوں بکھر بکھر کر روئی جیسے کوئی بچھڑا ہوا مدتوں بعد ملتا ہے۔

باہر چھم چھم برف کا مینہ برس رہا تھا۔

برف کے گنگنانے کی آواز اندر بھی آ رہی تھی۔

کمرہ سارا جیسے جگنوؤں سے بھر گیا۔ پھول خوشبو دینے لگے۔ سارا ماحول رقص کرنے لگا۔

اس نے کندھے سے سر نہیں اُٹھایا۔

"کرشمے ہوتے ہیں اس زمانے میں بھی......

رب اپنی پہچان کراتا ہے۔ جب یوں دلوں میں آ کر بیٹھ جاتا ہے......

عجیب ہے یہ...... سب کچھ...... لڑکپن میں یہ گھر دیکھا کرتی تھی...... جب یہ گھر بنا بھی نہ ہوگا۔

اس کے اندر بیٹھا ہوا دیوتا جیسا بندہ...... ابھی بشری معاملوں میں اُلجھا ہوا تھا اور پھر ایک دن مجھے آنا تھا یہاں...... اس کندھے پر سر رکھ کے اپنی لوٹی ہوئی حسرتوں کا ماتم کرنے کے لئے۔

آج کے بعد اب کوئی تمنا نہیں عطار صاحب......!

آپ کون ہیں......؟ کیا ہیں......؟ مجھے کیا خبر......؟ ایک رات آپ کے کاندھے پر سر رکھ کے ستانے کو مل گئی۔ بس اتنا ہی مانگا تھا میں نے......

خدا کرے یہ رات کبھی ختم نہ ہو......

حشر سے جا ملے یہ رات......

جانے کب یوں ہی بولتی بولتی وہ کاندھے پر سر رکھے رکھے سو گئی۔

اس کی لمبی لمبی سانسیں سنائی دینے لگیں۔

عطار صاحب نے اسے اس حالت میں جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کا سر سہلاتے سہلاتے...... صوفے کے بازو پر سر ٹکا کے وہ بھی سو گئے۔

رات جاگتی رہی...... برف جاگتی رہی......

شرارت سے دروازوں کی درزوں سے جھانکتی رہی......

صدیوں کے جاگے......

ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے......

قریب آئے تو سو گئے......!!

❁ ❁ ❁

پتہ نہیں کتنے سالوں کے بعد وہ گھر زندہ ہوگیا۔ اس گھر کی اِک اِک چیز جاگ اُٹھی۔ در و دیوار بولنے لگے۔ چھتیں باتیں کرنے لگیں۔ تصویریں مسکرانے لگیں۔ آہٹیں سر اُٹھانے لگیں۔

سوموار کی صبح جب عطار صاحب اس کا سامان اُٹھا کر اسے ہوسٹل لے کے جانے لگے تو انہوں نے موٹر میں بیٹھتے ہی کہا۔

"تسبیح......! وہ دن خواب کی طرح گزر گئے ہیں۔ اُصولاً میں تمہیں ہوسٹل چھوڑ آؤں گا۔ کیونکہ ہمارا گھر یونیورسٹی سے بہت دُور ہے۔ وہاں تمہیں اور بھی بہت سی سہولتیں ہوں گی۔ یوں دن میں میں بھی اپنی کلاسز لینے کے لئے آجایا کروں گا۔ مگر تم وعدہ کرو اب ویک اینڈ تم میرے ساتھ گزارا کرو گی۔"

وہ مسکراتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

وہ اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"آپ بھی ایک وعدہ کریں۔ مجھے اس گھر میں گھریلو عورت کی طرح رہنے کی اجازت دیں گے۔"

''گھریلو عورت یا..... گھر والی کی طرح.....؟''

وہ شرارت سے بولے۔

''جو بھی آپ سمجھ لیں۔ مگر بات یہ ہے کہ میں ایک ورکنگ کلاس سے تعلق رکھتی ہوں اور مہمانوں کی طرح نہیں رہ سکتی۔

اور......

اور کوئی میرا بہت دھیان رکھے..... بار بار حال پوچھے..... اور ناز نخرے اُٹھانے لگے..... تو مجھے ہیجان ہونے لگتا ہے..... میں تھکنے لگتی ہوں۔

اور......

اور ہفتہ اتوار کو آپ کی لبنانی ملازمہ چھٹی کرتی ہے۔ ہفتہ اتوار کو میں خود کھانا پکایا کروں گی..... اور آپ کو کھانا پڑے گا۔

اور......''

وہ اسی انداز میں بولتے گئے۔

''پہلے اتنا تو مان لیں.....!''

وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔

''میں سمجھا پریوں کے ولیس کی شہزادیوں والی نہ جانے تم کتنی کڑی شرطیں رکھ دو گی۔ ہاں بھئی.....! منظور ہے..... منظور ہے..... میں بھی پاکستانی کھانے کھانے کو ترس گیا ہوں۔ جیسے میری ماں گاؤں میں بنایا کرتی تھی۔''

''پتہ نہیں ان جیسے کھانے بنا سکتی ہوں یا نہیں..... مگر بچے کہتے ہیں..... کھانا میں اچھا بنا لیتی ہوں۔''

''ہمیں یقین ہوا ہم کو اعتبار آیا۔''

وہ سر جھکا کر بولے۔

''اور یہ کہ......''

''ہیں.....! ابھی کچھ اور بھی ہے.....؟''

''ہاں.....! یہ اسی اور کا حصہ ہے۔''

''بولو..... بولو.....! جلدی سے بولو.....!''

''پھولوں کی دُکان پر چلئے۔ بہت سے سفید پھول خرید دیجئے..... اور وہاں سے سیدھا مجھے ربیکا کی قبر پر لے چلئے۔ اس کا شکریہ ادا کئے بغیر میں یہاں سے نکل نہیں سکتی۔''

عطار صاحب خاموش ہوگئے اور موٹر پھولوں والی دُکان کی طرف موڑ دی۔

تسبیحہ نے ان کی خاموشی کو محسوس کیا۔ ان کی صورت دیکھ کر بولی۔

''آپ کو آئیڈیا پسند نہیں آیا.....؟''

وہ اپنی آواز پر قابو پا کر بولے۔

''آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک وہ بے تحاشا یاد آ گئی اور بہت سی یادیں بھی آنے لگیں۔ ویسے تم کتنی عالی ظرف ہو۔ خود مجھے یاد دلا دیا۔ میں بھی کافی عرصے سے اس کی قبر پر نہیں جا سکا۔ بس سفروں میں زیادہ رہنے لگا ہوں۔''

اتنے میں پھولوں والی دُکان آ گئی۔

سیلز گرل نے مسکرا کر ویلکم کیا اور پوچھا کس تقریب کے لئے پھول درکار ہیں۔

دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر تسبیحہ جلدی سے بولی۔

"ایک مشترکہ دوست کی قبر کے لئے۔"

"اوہ......!"

کہہ کے لڑکی مڑ گئی اور بہت ہی خوب صورت اور مناسب رنگوں میں بوکے بنا کر لے آئی۔

دونوں ربیکا کی قبر پر چلے گئے۔

پھول چڑھا کر تسبیحہ دُعا مانگنے لگی۔ پتہ نہیں کیا دُعا مانگ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی گر رہے تھے۔

البتہ عطار صاحب بلند آواز میں بولے۔

"روب......! دیکھو میں تسبیحہ کو ڈھونڈ کر لے آیا ہوں۔ ہم دونوں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ تم نے کہا تھا نا...... کہ تم جیسس سے دُ کرو گی ہمارے ملنے کی۔ ویسے یہ سب تمہاری دُعا سے ہی ممکن ہوا۔ ورنہ...... تیس پینتیس برس کے بعد اتنی بڑی دُنیا میں کسی کو تلاش کر لینا ممکن ہی نہیں تھا۔

روب......! اب دُعا کرتی رہنا...... ہم تمہاری وصیت اور خواہش پر جلدی عمل کر سکیں۔

❁❁❁

تسبیحہ جب عطار صاحب کے ساتھ الفلاح یونیورسٹی کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ جو حد نظر تک پھیلی ہوئی ایک دِلکش منظر پیش کر رہی تھی۔

"ماشاء اللہ......!"

اس نے اندر قدم رکھتے ہی کہا۔

"عطار صاحب......! اس یونیورسٹی کے تمام شعبے دیکھنے کے لئے تو ایک ہفتہ درکار ہوگا۔"

وہ ہنس پڑے۔

"درست کہا تم نے...... تمہیں ہم ایک ہفتہ دیں گے۔ اسے دیکھنے اور پرکھنے کے لئے۔ گو اس اتنی بڑی یونیورسٹی کی تعمیر میں دس سال لگے ہیں۔"

جونہی وہ لوگ بلڈنگ کے اندر آئے، اس نے دیکھا۔ سامنے والی دیوار پر جلی حروف میں علامہ اقبال کا شعر لکھا ہوا تھا۔ ساتھ میں اس کا ہر اس زبان میں ترجمہ لکھا ہوا تھا جو اس یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی تھی۔ شعر یہ تھا ۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

پھر اس سے اگلی دیوار پر قائد اعظم محمد علی جناح کے اقوال لکھے ہوئے تھے۔

''جب آپ اخلاقی، ثقافتی اور سیاسی شعور کی طاقت پیدا کرلیں گے تو جس چیز کے حصول کا ارادہ کریں گے وہ حاصل ہو جائے گی۔''

''ایک ایسی متحدہ قوم جو عظیم ارادے کی مالک ہو، عظیم تہذیب رکھتی ہو، عظیم تاریخ کی وارث ہو۔ اسے کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔''

''ایمان، اتحاد اور تنظیم کے اُصولوں پر کاربند رہ کر ہم ہر بڑی قوم کے برابر ہو سکتے ہیں۔''

ہر شعبے کے صدر دروازے پر علامہ اقبال کے اشعار اور قائد اعظم کے اقوالِ زریں درج تھے۔

تسبیحہ سرخوشی کے عالم میں علامہ کے اشعار اونچی آواز میں پڑھتی جا رہی تھی اور داد بھی دیتی جا رہی تھی۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اور

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اور

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست!
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں!

اور

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
بحث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

بے اختیار تسبیحہ شعر پڑھتی جاتی اور اس کے منہ سے واہ واہ کے الفاظ نکلتے جاتے۔ علامہ اقبال کے اشعار اس نے پہلے بھی کئی بار پڑھے تھے۔ مگر یہاں دیواروں پر ان کو پڑھنے کا لطف ہی نرالا تھا۔

اسی طرح قائد اعظم محمد علی جناح کے اقوال کے ساتھ ان کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ رُک جاتی اور پڑھنے لگتی۔

''میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں اور میرا خدا یہ کہے کہ جناح! تم بے شک مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبے

میں اسلام کے علم کو سربلند رکھتے ہوئے مرے۔"

"تسبیح......! اگر تم رُک رُک کے یوں ہی ہر دیوار پر لکھا پڑھتی رہیں تو میرا خیال ہے آج کا دن اسی کام میں صرف ہو جائے گا۔ بہتر ہے جب یہاں سے گزرتی رہنا، پڑھتی رہنا۔ چھ مہینے میں تو ساری دیواریں پڑھ ہی لو گی۔"

بالآخر عطار صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے......!"

وہ ہنس پڑی۔

"آپ درست کہتے ہیں۔ میں بھی پاگل ہوں۔ یہاں قائد اعظم اور علامہ اقبال کا نام دیکھ کر جذباتی ہوگئی۔"

"ہاں......! اسی جذباتیت کی اس یونیورسٹی میں ضرورت ہے۔"

"مگر آپ نے بھی بہت موضوع کوٹیشن اور بہت اعلیٰ درجے کے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔"

وہ بولی۔

"انتخاب میں نے نہیں کیا۔"

وہ بولے۔

"ان دونوں لیڈروں کا سارا کام ہی سمجھو کہ انتخاب ہے۔ قائد اعظم کا کوئی قول لے لو...... علامہ کا کوئی شعر دیکھ لو۔ یہ انگلی پکڑ لیتے ہیں اور چلنا سکھانے لگتے ہیں۔ قائد اعظم نے پاکستان کے لئے پورا ضابطہ اخلاقیات،

معاشیات، سیاسیات دیا ہے ان کی تحریر پڑھ کر دیکھ لیں۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ سٹاف روم میں پہنچ گئے۔ وہاں عطار صاحب کی ہدایت کے مطابق تمام پروفیسر صاحبان موجود تھے۔ تسبیحہ کا سب سے تعارف کرایا گیا اور اسے اس کے کام کی نوعیت سمجھائی گئی۔

وہاں سے وہ اپنے ہاسٹل چلی گئی۔

شام کی چائے پر ان تمام خواتین و حضرات سے اس کا باقاعدہ تعارف کرایا گیا جو اس ہاسٹل میں مقیم تھے۔

یہ دیکھ کر تسبیحہ کو حیرت ہوئی کہ ہاسٹل میں خواتین پروفیسرز کی تعداد زیادہ تھی اور ان سب کا تعلق مسلم ممالک سے تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد بڑا دوستانہ ماحول ہوگیا۔

تسبیحہ نے اپنے کمرے میں جا کر اپنا سارا سامان درست کر لیا۔ یہ بڑا خوب صورت ہاسٹل تھا۔ ہر قسم کے ضروری فرنیچر اور ساز و سامان سے آراستہ۔

اس کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کچن تھا۔ جہاں ناشتہ بنانے کا سارا برقی سامان رکھا ہوا تھا۔ وہاں ایک ہدایت نامہ بھی رکھا ہوا تھا جس کی رو سے تمام رہائشی صرف رات کے کھانے پر ڈائننگ ہال میں اکٹھے ہوتے تھے۔ دن کو کھانے پینے کا اہتمام وہ خود کرتے تھے اور اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔

یہ سارا بندوبست تسبیحہ کو بہت پسند آیا تھا اور وہ جلد ہی پورے ماحول سے مانوس ہوگئی تھی۔

گزشتہ دس سالوں میں پاک الفلاح یونیورسٹی سے تقریباً ڈھائی لاکھ طلباء اور طالبات اکتساب علم کر کے جا چکے تھے۔ ہر سال تقریباً پانچ ہزار طلباء داخلہ لیتے تھے۔ جن کا ہر ملت اور ہر مذہب سے تعلق ہوتا تھا۔ اگرچہ اس یونیورسٹی کی شہرت مسلم ممالک میں بہت زیادہ تھی، مگر نان مسلم سٹوڈنٹ بھی کثیر تعداد میں داخلہ لیتے تھے۔

یہاں پر ایک بہت بڑا ریسرچ سنٹر تھا۔ جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ مختلف قسم کے مذاہب پر بھی ریسرچ کرنے کی سہولت اور اجازت تھی۔

تسبیحہ نے اپنے پروگرام کے مطابق یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔

ہفتے میں تین دن اسے مختلف کلاسز میں لیکچر دینا ہوتے۔ دو دن وہ ریسرچ سنٹر میں نصاب دان پروفیسروں کے ساتھ گزارتی۔

ایک دن وہ مختلف ممالک سے آنے والے طلباء اور طالبات کے ساتھ لائبریری میں ایک فکری نشست رکھتی تھی۔

دن میں کبھی کبھار عطار صاحب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اگرچہ وہ روزانہ یونیورسٹی آتے تھے مگر اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔

البتہ ویک اینڈ پر وہ اسے لینے آجاتے اور ہفتہ اور اتوار کا دن وہ ان کے ساتھ گزارتی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس روز یونیورسٹی کے علامہ اقبال آڈیٹوریم میں ایک بہت بڑا مباحثہ تھا۔ جو کہ ہر مہینے کے آخر میں منعقد کرنے کی روایت تھی۔

اس یونیورسٹی کے اندر چھوٹے بڑے بے شمار ہال تھے۔ عطار صاحب نے ہر حال کا نام تحریک پاکستان کے اکابرین کے نام پر رکھا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر شخصیت کے مختصر حالاتِ زندگی دیواروں پر لکھوا دیئے تھے تاکہ ان کا کردار سمجھنے میں آسانی ہو۔

آج کے مذاکرے میں عطار صاحب نے تسبیحہ ربانی کو صدارت کے لئے تفویض کیا تھا۔

تسبیحہ جب اس کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں آکر سٹیج پہ بیٹھی تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔

اس آڈیٹوریم کے چاروں طرف علامہ اقبال کے اشعار جلی حروف میں اور ان کے ساتھ تراجم لکھے ہوئے تھے۔

ایسے لگ رہا تھا کہ اس آڈیٹوریم کے اندر ایک چھوٹا سا پاکستان آباد ہوگیا ہے۔ مگر جب بین الاقوامی طلباء و طالبات کو دیکھتی تو پھر احساس ہوتا کہ وہ امریکہ کی یونیورسٹی کے اندر ہے۔

دس سالوں میں عطار صاحب نے کمال کا کام کر دکھایا تھا۔ اسی لئے تو ہمہ وقت ان کے چہرے پر ایک اطمینان کا نور رہتا تھا۔

سٹیج سکریٹری نے جو کہ ایک سٹوڈنٹ تھا، اس نے مذاکرے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ ایک طرف چار پروفیسر جج بن کر بیٹھے تھے۔ عطار صاحب اگلی نشستوں پر سامعین کے درمیان بیٹھ گئے تھے۔ سٹیج سکریٹری نے تسمیحہ کا تعارف کرا کے اسے صدارت کے لئے سٹیج پر بلا لیا۔ تالیوں کی گونج میں جب وہ اُٹھی تو اس کا دل دھڑک اُٹھا اور منہ سرخ ہوگیا۔

سٹیج سکریٹری نے بتایا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے طلباء اور طالبات جو اس مباحثے میں حصہ لینا چاہیں گے، اپنے نام مجھے بھجوا دیں گے۔ جب کسی مقرر یا مقررہ کا نام بولا جائے گا تو وہ اپنی نشست پر ہی کھڑا ہو جائے گا۔ ہر نشست کے آگے مائیک لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے جج صاحبان اس کو ایک ٹاپک الاٹ کریں گے۔ پانچ اور سات منٹ کے اندر اندر وہ اپنا مطمع نظر پیش کر دے گا۔ یہ ایک فی البدیہہ قسم کا مباحثہ ہوتا ہے۔ جس میں سٹوڈنٹس کی ذہنی صلاحیتوں کو اور سوچ کے انداز کو پرکھا جاتا ہے اور یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس نے اس یونیورسٹی میں کیا کچھ سیکھا ہے۔ اور حالات حاضرہ و بین الاقوامی اقتصادی، سیاسی اور معاشی بدلتے ہوئے حالات پر ان کی کتنی گہری نظر ہے۔

دستور کے مطابق سب سے آخر میں صدر صاحبہ اپنے خیالات کا اظہار کریں گی۔

مباحثہ تلاوتِ کلامِ پاک سے شروع ہوا۔ مصر کے ایک سٹوڈنٹ

عامر نے بڑی پُرسوز آواز اور مصری لہجے میں تلاوت کی۔ جس کا ترجمہ بھی اس نے انگریزی زبان میں کیا۔

سٹیج سکریٹری نے پھر اعلان کیا کہ ہمارے ہاں ترجمے کا پورا بندوبست ہے۔ مقرر کسی بھی زبان میں آسانی سے تقریر کر سکتا ہے۔ میزوں کے آگے بٹن لگے ہیں۔ سامعین جس زبان میں ترجمہ سننا چاہیں بٹن دبا کر سن سکتے ہیں۔

مباحثہ شروع ہوا تو ملائیشیا سے آئے ایک طالب علم عبداللہ بن زیاد کا نام پکارا گیا وہ کھڑا ہوگیا اور جج صاحبان کی طرف دیکھنے لگا۔

ان میں سے ایک جج نے اسے اس کے موضوع سے آگاہ کیا۔

''آپ کے خیال میں عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے......؟''

عبداللہ بن زیادہ بولنے لگا۔

''میڈم پریذی ڈنٹ......!

آج عالم اسلام دُنیا بھر میں کڑی تنقید کا باعث بن رہا ہے۔ حالانکہ نائن الیون ایک انفرادی قسم کی جسارت تھی۔ مگر اس کا عذر دے کر سارے عالم اسلام پر اور خصوصیت سے مسلمانوں پر جو لعن طعن ہو رہی ہے، وہ اس خوف کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اہل مغرب کے دل میں اسلام کی طرف سے بٹھا دیا گیا ہے۔

دہشت گردی کون کر رہا ہے......؟ کون کروا رہے ہیں......؟ اس کے عوامل کیا ہیں......؟ اور باری باری صرف مسلمان ملک ہی اس کا نشانہ کیوں

بن رہے ہیں......؟ سوچنے کے لئے کافی ہے کہ اکیسویں صدیٰ کی اسلام کے خلاف یہ ایک عالمی سازش ہے۔

عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اتحاد بین المسلمین کی کمی ہے اور اس کا فائدہ دوسری قوتیں اُٹھا رہی ہیں۔

سوڈان...... الجزائر...... الجیریا...... فلسطین...... کشمیر...... افغانستان اور پاکستان اپنی اپنی بقاء کی جنگ لڑتے رہتے ہیں۔"

اس نے دلائل دے کر اپنی تقریر ختم کی تو شام کے ابراہیم الاسد کا نام پکارا گیا۔

اسے موضوع دیا گیا۔

"اسلام کو اپنی نشاۃ ثانیہ کے لئے کیا اقدام اُٹھانے چاہئیں......؟"

"صدر گرامی......!"

وہ بولنے لگا۔

"اسلام ملکوں کو اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ بعض مسلم ملک بہت امیر ہیں۔ اور بعض بہت غریب ہیں۔ بعض کے ہاں تعلیم کی کمی ہے اور بعض کے ہاں وسائل کی کمی ہے۔ امیر مسلمان ملکوں کو چاہئے کہ وہ غریب ملکوں کو بلاسود قرضے دیں۔ امیر مسلمان ملک مل کے ایک ورلڈ بینک جیسا عالمی اسلامی بینک بنائیں۔ جو غریب ملکوں کو بلاسود قرضے دے، اور قدرتی آفات کے موسم میں آگے بڑھ کر انہیں اپنے قدموں پر کھڑا کرنے کی ترغیب دے۔

تیل پیدا کرنے والے ملک دوسرے مسلمان ملکوں کو رعایتی نرخوں پر

تیل مہیا کریں اور بدلے میں ان کی مصنوعات خریدیں۔

ایک اسلامک میڈیا چینل ہو جو ہر زبان میں اسلامی دُنیا کی خبریں اور ان کے ثقافتی پروگرام نشر کرتا رہے۔

ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا جائے جو Times اور News Week کی طرز کا ہو جو مسلمانوں کے ترقیاتی پروگراموں کے بارے میں لکھ رہا ہو۔"

اس کے بعد ایک لڑکی کا نام پکارا۔

ربیعہ کریم جو پاکستان سے تھی۔ جج نے اس کو ٹاپک دیا کہ

"آج پاکستان کا کیا بڑا مسئلہ ہے......؟"

"پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آج پاکستان میں ہر کوئی تبلیغ کرنا چاہتا ہے۔ عمل کی مثال کوئی قائم نہیں کرنا چاہتا۔ جس کو دیکھو دوسروں پر کیچڑ اُچھال رہا ہے۔ تنقید کر رہا ہے۔ کوئی سیاسی شخصیت ہو، سماجی ہو یا مذہبی شخصیت، بغیر ضرورت کے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اسلام کے نام پر ووٹ لیتے ہیں۔ اسلام کے نام پر سود لیتے ہیں۔ اسلام کے نام پر ہشت گردی کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام ایک امن و امان پھیلانے والا مذہب ہے۔

اسلام ایک ہمیشہ رہنے والی محبت کا نام ہے۔ اسلام ایک مسلسل صبر کا نام ہے۔ مگر پاکستان کے اندر مسلسل اسلام کا استعمال ہو رہا ہے۔"

پھر ایک اور نوجوان فلسطین سے آیا تھا، اس کو تاریخ کے موضوع پر بولنے کے لئے کہا گیا۔

اس نے آتے ہی کہہ دیا کہ تاریخ سے ناطہ توڑنے والی قومیں

بدنصیب ہوتی ہیں۔ جغرافیہ بدلتا رہتا ہے۔ مگر تاریخ ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔

ایک اور پاکستان سے آئے سٹوڈنٹ نے اپنی تقریر میں کہا۔

''میں نے یہاں آ کر دیکھا ہے۔ پاکستان اپنے بہترین دماغ امریکہ بھیج دیتا ہے۔ یہاں پڑھنے والے لوگوں کو جب تحصیل علم کے بعد اچھی نوکریاں آفر ہوتی ہیں تو وہ یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر ہماری ذہین نسلیں یہاں سے سیکھ کر واپس اپنے ملک میں چلی جائیں اور جا کر تمام شعبوں میں کھپ جائیں تو حالات جلد ٹھیک ہو سکتے ہیں۔''

اس طرح دو گھنٹے کے مباحثے میں کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جس پر مختلف ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔

واپسی پر تسبیحہ نے عطار صاحب سے کہا۔

''مجھے ان نوجوانوں کے خیالات سن کر بہت خوشی ہوئی ہے۔

اور زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ جس قسم کی نسل آپ چاہتے تھے۔ وہ پروان چڑھ رہی ہے۔

❀❀❀

یوں گزشتہ چھ ماہ میں تسبیحہ ہر ویک اینڈ پر عطار صاحب کے گھر آجاتی تھی۔ دونوں مل کر سودا لاتے۔ وہ ہفتے کا سارا دن ان کے پاکستانی کھانے پکا کے فریزر میں رکھتی رہتی۔ پھر رات کا کھانا دونوں مل کر کھاتے۔ کبھی فارغ ہو کر شاپنگ کرنے چلے جاتے۔ کبھی کوئی فلم دیکھنے چلے جاتے۔ وقت ایک سنہری سپنے کی طرح گزر جاتا۔

اب تسبیحہ کی ٹریننگ کے چھ مہینے گزر گئے تھے اور یہ آخری ویک اینڈ تھا۔ جو وہ ان کے ساتھ گزارنے آئی تھی۔ سوموار کی دوپہر کو اس کی فلائٹ تھی۔ اس نے بچوں کے لئے شاپنگ بھی کر لی تھی۔

رات جب وہ دونوں کھانے کی میز پر بیٹھے تو تسبیحہ حسب عادت ان کی پلیٹ میں کھانا ڈالتی جا رہی تھی، تو وہ بولے۔

''تسبیح......! تم نے ارادتاً میری عادتیں بگاڑی ہیں۔''

''وہ کیسے......؟''

''ایک عرصہ سے میں تنہا رہ رہا تھا۔ ازدواجی زندگی کی راحتوں سے محروم تھا۔ مگر تم نے آ کر میری زندگی کا ہر شعبہ سنبھال لیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا...... میں تو جنم جنم سے تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں۔ یہ سب تم نے

کتنی ہنرمندی سے کرلیا۔"

"ہنرمندی مت کہیں...... مجھے کام کرنے کی عادت ہے۔"

"نہیں......! یہ کام سے کچھ ماورئی ہے۔تم سارے ہفتے کا کھانا بنا کر رکھ جاتی ہو۔ ان کے اوپر چٹیں لگا جاتی ہو۔ میں بس نکالتا ہوں اور گرم کر کے کھالیتا ہوں۔ میری زبان کا ذائقہ ہی بدل گیا ہے۔ اور اب آج سارا دن تم مہینے بھر کا کھانا بنا کے رکھتی رہی ہو۔ سوچا تم نے مہینے کے بعد میں کیا کروں گا......؟"

"مہینے کے بعد آپ پاکستان آ رہے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے نا......!"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں......! یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔تم اتنے تھوڑے وقت میں اتنا کام کیسے کر لیتی ہو......؟ دیکھو تم نے لاؤنج کی سیٹنگ بھی بدل دی ہے۔ اب کتنا اچھا لگ رہا ہے لاؤنج...... یہ وہی لاؤنج ہے...... اور کھانے کے کمرے کی ترتیب بھی بدل دی ہے۔ ایسے لگتا ہے اس تبدیلی کی ضرورت تھی۔ تم نے یہ سب کیسے محسوس کرلیا......؟"

"عطار صاحب......! بات یہ ہے کہ انسان ذرا تلون مزاج ہوتا ہے۔ اگر اس کے ارد گرد کے ماحول میں گاہے بگاہے تبدیلی پیدا کی جاتی رہے تو اسے اچھا لگتا ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ لاؤنج میں صوفوں کی جگہ بدل دی ہے اور اسی مناسبت سے ہر شے رکھ دی۔ کھانے والے کمرے میں بھی فرنیچر ہلانے سے بہت گنجائش پیدا ہوگئی۔ سارا ماحول نیا نیا ہوگیا ہے۔"

وہ بولی۔

"سارا ماحول نیا نیا نہیں ہوگیا۔ بلکہ بتا رہا ہے کہ کون اس ماحول کو سجانے آگیا ہے۔

تسبیح......! تم نے ہر کمرے کی سیٹنگ (Seting) بدلی ہے۔ مگر میرے بیڈ روم میں جھانکا تک نہیں جو عرصہ سے کباڑ خانہ بنا ہوا ہے۔"

تسبیح کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"آپ کے بیڈ روم میں جھانکنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ میں دانستہ اس طرف نہیں گئی۔

میری عادت ہے کہ میں چیزوں کو خیالوں میں بسا لیتی ہوں اور پھر انہیں کے حوالوں سے سوچنے لگتی ہوں۔"

"یعنی......!"

وہ استفہامیہ نظریں اُٹھا کر بولے۔

"اچھا چھوڑیں...... اس مسئلے کو...... آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ رات کو ڈنر کے لئے جب آپ اور میں یہاں آکر بیٹھتے ہیں تو میری سامنے والی کرسی پر ربیکا آکر بیٹھ جاتی ہے۔ میں نے اکثر اسے بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ اس روز آپ نے حیران ہو کر پوچھا تھا نا کہ میں نے پلیٹ ادھر کیوں رکھ دی ہے......؟"

"ہاں ہاں......!"

وہ جلدی سے بولے۔

"آپ کی یہ بات سن کر وہ اُٹھ کر چلی گئی تھی۔"

’’کمال ہے......!‘‘

پہلے تو عطار صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر سر اُٹھا کر بولے۔

’’تسبیح......! میں اسے اپنا پاگل پن یا وہم سمجھتا رہا۔ میں نے بھی اکثر روب کی آہٹ محسوس کی تھی۔ مجھے لگتا تھا وہ آ کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئی ہے۔ اس کا وجود تو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا تھا اور سمجھتا تھا یہ میرا وہم ہے۔‘‘

’’مجھے بھی اس کا سراپا تو نظر نہیں آتا تھا مگر ایک احساس وہاں آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ لگتا تھا کوئی بیٹھا ہے۔ کوئی مسکرا رہا ہے۔ یوں سفید سفید گرد سی اُڑتی تھی۔‘‘

’’اُفوہ......!‘‘

عطار صاحب بولے۔

’’یہ وہم نہیں تھا۔ احساس نہیں تھا۔ یہ تو وہ تھی۔‘‘

’’خوش نظر آتی تھی...... ہے نا......؟‘‘

’’جی ہاں......!‘‘

’’تسبیح ......! اب تم مجھے پاگل نہیں کہو گی۔ جب میں تمہیں بتاؤں گا۔ ایک دن اس نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا تھا۔

’’اس عورت کو اگر تم پہلے ڈھونڈ لیتے تو کیا برا تھا......؟ اس کو سوتن بنا کر تو میں ساری عمر خوش رہ سکتی تھی۔‘‘

اسی طرح وہ کبھی کبھی بس تمہاری موجودگی میں آتی تھی۔ جب میں اکیلا ہوتا تھا، تب نہیں آتی تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ تمہارے یہاں آنے

سے بہت خوش تھی۔‘‘

’’نیک روحیں ایسی ہی ہوتی ہیں عطار......!‘‘

’’پتہ ہے تسبیح......! پچھلے ہفتے اس نے مجھے کیا کہا......؟‘‘

’’کیا......؟‘‘

’’بولی۔

’’شادی کب کر رہے ہو......؟ اور یہ کتنی اچھی شادی ہے جس میں تمہیں تین پلے پلائے بچے مل رہے ہیں۔‘‘

میں حیران ہوا تو وہ قہقہے لگاتی میڑھیاں چڑھ گئی۔ اور پھر معلوم ہے اس کی روح اکثر حلیمہ کے کمرے میں ہی آتی ہے۔‘‘

’’اللہ اس کو جنت میں آسودہ رکھے۔‘‘

تسبیح نے زیر لب کہا۔

عطار صاحب تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر ایک دم بولے۔

’’تسبیح......! اچھا ہوتا ہم یہیں شادی کر لیتے۔ اب اور وقت ضائع کرنے سے فائدہ......؟‘‘

وہ مسکرا دی۔

’’ہر کام قرینے سے ہی اچھا لگتا ہے۔ میں اپنے تینوں بچوں کو پہلے اعتماد میں لینا چاہتی ہوں۔ انہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ اس مقام پر انہیں کوئی احساسِ محرومی نہیں ہونا چاہئے۔‘‘

’’ان کو یہاں بلوا لیتے ہیں تسبیح......! بلکہ انہی سے یہ کام کروائیں گے۔‘‘

''اب آپ نوجوانوں والی جذباتیت نہ دکھائیں۔ سچ پکے سو بیٹھا ہووے۔ ویسے ہر موڑ پر میرے بچے مجھے یہ مشورہ دیتے رہے ہیں کہ اگر مجھے کوئی مناسب اور دل پسند شخص مل جائے تو میں شادی کر لوں۔ میں ان کے اس مشورے کا ہمیشہ مذاق اڑاتی رہی ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ عین بڑھاپے میں ایسا شخص مل جائے گا۔''

''اور وہ بھی بوڑھا ہی ہوگا......؟''

عطار صاحب نے بے ساختہ کہا تو دونوں ہنسنے لگے۔

''مجھے معلوم ہے وہ مخالفت تو نہیں کریں گے۔ مگر آپ کو تجربہ نہیں۔ بچوں سے بات کرنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ ورنہ بچے خفا ہو سکتے ہیں۔''

اگر ان کو اعتراض نہیں ہوگا تو پلیز فون پر بات کر لو......!''

''عطار صاحب......!''

وہ کھڑی ہوگئی۔

''اب دیکھیں آپ بچوں کی سی ضد نہ کریں۔ جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''ٹھیک ہے......!''

وہ بھی کھڑے ہوئے۔

''یہ گھر حقیقی معنوں میں گھر لگنے لگا تھا۔ میں تو آنے والے دنوں سے خوف زدہ تھا۔''

''صبح میری فلائٹ ہے۔ کتنے بجے ایئرپورٹ جانا ہوگا......؟''

اس نے پوچھا۔

''ہم انشاء اللہ......! 9 بجے ناشتے کے بعد نکل جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے......! پھر میں چلتی ہوں۔ مجھے تھوڑی سی پیکنگ بھی کرنی ہے۔''

''شب بخیر......!''

''شب بخیر......!''

❀ ❀ ❀

بوسٹن ایئرپورٹ پر حسب معمول کافی رش تھا۔ وہ عطار صاحب کے ساتھ ڈیپارچر لاؤنج میں کھڑی تھی۔ چھ مہینے پہلے جب شدید برفباری ہو رہی تھی۔ وہ یہاں اُتری تھی۔ اب جب جولائی کی شدید گرمی پڑ رہی تھی تو وہ جا رہی تھی۔ ان چھ مہینوں میں زندگی کتنی بدل گئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں...... عمر رفتہ لوٹ کر نہیں آتی...... مگر جذبے تو لوٹ کر آ جاتے ہیں۔

جاتے وقت اس کا دل بھی قدرے اُداس تھا۔ جتنے آسودہ دن اس نے بوسٹن میں گزارے تھے، ان کے لئے اس کی زندگی ہمیشہ ترستی رہی تھی۔

مائیکروفون میں آخری اعلان ہوا تو عطار صاحب نے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ بازو اس کے گرد حمائل کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر خدا حافظ کیا۔

وہ اتنی نروس ہوئی کہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ بس اندر کو لپکی۔

جہاز میں جا کر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مگر مشک عنبر کی طرح ایک بوسہ جو اس کی پیشانی پر سجدہ ریز تھا، اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہا۔

وہاں کوئی شے رکھی تھی ماتھے پر...... جسے ہاتھ لگا کر وہ محسوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ گویا ہاتھ لگانے سے یہ نشان مندمل ہو جائے گا، مٹ جائے گا۔

وہ اسے زندگی بھر ماتھے کا جھومر بنا کر ماتھے پر سجا رہنے دینا چاہتی تھی۔

ایسا نشہ تھا اس مشک عنبر کا کہ اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا...... سیٹ سیدھی کی اور نیند کی نامعلوم وادیوں میں یوں اُتری جیسے جنم جنم کے رت جگے کا حساب چکانا چاہتی ہو

کوئی زور زور سے اس کے کندھے ہلا رہا تھا۔

وہ مُڑ گئی...... چونک گئی...... آنکھوں سے کالی پٹی ہٹا کر دیکھی تو وہ ایئرہوسٹس تھی۔

''اوہ......!''

وہ تو جہاز میں تھی...... اس نے سر درد کی گولی کھائی تھی اور اپنی زندگی کے واقعات دوہراتے دوہراتے غالباً سو گئی تھی۔

اس نے آنکھیں جھپک جھپک کر اپنے آپ کو جگایا۔

ایئرہوسٹس کہہ رہی تھی۔

''میڈم......! احرام باندھ لیں۔ جہاز میں بار بار اعلان ہو رہا ہے کہ جو لوگ عمرے کی نیت سے جا رہے ہیں۔ اس مقام پر احرام باندھ لیں۔''

''افوہ......!''

اس نے اپنا دستی تھیلا اُٹھایا اور غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ احرام باندھ کے آئی تو بزنس کلاس میں لبیک اللھم لبیک کا ایک غلغلہ مچا ہوا تھا۔

اس نے تسبیح نکال کے ہاتھ میں پکڑ لی اور ان آوازوں میں اپنی آواز ملانے لگی۔

تسبیح ہلاتے ہلاتے یکا یک اس نے غیر ارادی طور پر اپنے ماتھے کو چھو لیا۔ ایسے لگا آج ماتھے کا نشان لو دے رہا تھا۔ ابھی ہاتھ کھینچ نہ پائی تھی کہ اکانوی کلاس سے اس کا کزن زین العابدین اُٹھ کر آ گیا اور بولا۔

''آپا......! ابھی جہاز جدہ ائیر پورٹ پر لینڈ کر جائے گا۔ اُترتے ہی ہم سب اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔ آپ بتا دیں آپ نے عمرہ ہمارے ساتھ کرنا ہے۔ یعنی ہمارے ساتھ مکہ معظمہ جائیں گی......؟''

وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تو وہ جلدی سے بولا۔

''میری سالی نمرہ یہاں رہتی ہے نا......! وہ لوگ ہمیں لینے آئیں گے۔ ہم تو ان کے ساتھ عمرہ کرنے جائیں گے۔''

''تھینک یو بھائی......!''

تسبیحہ نے سکون سے کہا۔

''بس یہاں تک آپ کے ساتھ آ گئی۔ غنیمت ہے۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ محرم والا مسئلہ تمہاری وجہ سے حل ہو گیا۔''

''آپا......! میں آپ کا بھائی نہیں ہوں، سگا نہیں تو کیا ہوا، آپ کو سگی بہن ہی تو سمجھتا ہوں۔ میرے لئے تو بڑا اعزاز ہے آپ کے ساتھ آنا۔''

''جیتے رہو زین......!''

تسبیحہ بولی۔

''یہاں میرا ایک منہ بولا بھائی ہے نا......! شیخ عبدالعزیز...... ان کی فیملی مجھے لینے آ جائے گی...... اور میں عمرہ بھی ان کے ساتھ کروں گی۔''

''ٹھیک ہے آپا......!''

اس نے جواب دیا اور واپس جانے لگا۔ کیونکہ جہاز لینڈ کرنے کے اشارے ملنے لگے تھے۔ جن دنوں تسبیحہ تہذیب کالج کی پرنسپل تھی۔ عرب ملکوں کی لڑکیاں تحصیل علم کے لئے آتی تھیں اور ہوسٹل میں ہی رہا کرتی تھیں۔

انہی دنوں شیخ عبدالعزیز الحسین الخماش اپنی دو بیٹیوں کو داخل کرانے آئے تھے اور تسبیحہ کے اخلاق اور رواداری سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کی بیٹیوں عائدہ اور مائدہ کے لئے ہوسٹل میں جگہ بالکل نہیں تھی۔ تب اس نے ان دونوں بچیوں کو اپنے پاس اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔

اگلے سال ان کی والدہ اور والد دونوں تسبیحہ کا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔ کافی دن وہ اس کے مہمان رہے۔ شیخ عبدالعزیز نے اس کو اپنی بہن بنا لیا۔ جب بھی آتے بھائیوں کی طرح بے شمار تحائف لے کر آتے۔ ان کی بیٹیاں چار سال تک اس کالج میں پڑھتی رہی تھیں۔ تسبیحہ نے ان کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ اب ان کی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو گئی تھی۔

لیکن بہن بھائی کی طرح آنا جانا تھا۔ ان کی مہمانداری میں تسبیحہ نے ایک حج اور ایک عمرہ پہلے بھی کیا تھا اور اب بھی وہ یہی کہا کرتے تھے کہ یہ آپ کے بھائی کا گھر ہے۔ آپ کہیں اور قیام نہیں کر سکتیں۔ اسی لئے تو انہوں نے شیخ عبدالعزیز کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ جہاز کے لینڈ کرتے ہی پھر لبیک اللھم لبیک کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔

تسبیحہ نے اپنی سیٹ پر ہی جلدی جلدی دو نفل نیت کے پڑھ لئے اور مسافروں کے ساتھ باہر آ گئی۔ قطاریں بننے تک لوگوں کو یہاں بھی اپنے سامان کا ہی فکر رہا۔ مگر اسے معلوم تھا۔ صبر و تحمل کا سارا مظاہرہ جدہ ائیر پورٹ

پہ بنی ہوئی ان قطاروں کے اندر ہی کرتا تھا۔

وہ جدہ ائیرپورٹ سے باہر نکلی تو شیخ الحماش کا سارا خاندان اس کے استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد وہ سب اسے لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوگئے۔ کیونکہ وہ سب اس کے ساتھ عمرہ کرنے کی نیت سے ہی آئے تھے۔

عمرے کے بعد انہوں نے وہیں ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور رات بارہ بجے تک جدہ واپس آگئے تھے۔ ان کے گھر میں تسنیحہ کے لئے ایک کمرہ مخصوص تھا۔

شیخ عبدالعزیز نے اسی کی خاطر اس سے تھوڑی سی اُردو سیکھ لی تھی۔ اسی طرح تسنیحہ نے بھی ان کی خاطر ان کی فیملی سے تھوڑی بہت عربی سیکھ لی تھی کہ وہ ان کے سارے خاندان سے بڑی آسانی کے ساتھ گفتگو کرسکتی تھی۔

اپنے کمرے میں جانے سے پہلے تسنیحہ نے کہا۔

''یا اخی......! مجھے آپ سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔ کل آپ کے پاس وقت ہوگا......؟''

''یا اختی......! کیوں نہیں......؟ آپ جب بھی کہیں میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس وقت آپ اطمینان سے استراحت فرمالیں۔ کل سب باتیں کر لیں گے۔ کیونکہ مدینہ منورہ جانے کا پروگرام بھی تو بنانا ہے۔''

''جی بہت اچھا......!''

کہہ کر تسنیحہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

تقدیر کہاں لے کے چلی......؟

زمین و آسمان میں فقط تیرا جمال ہے
یہ کائنات......
تیرا ایک خواب ہے
کہ میرا اِک خیال ہے
فنا بھی اِک حجاب ہے
بقا بھی اِک سوال ہے
کمال ہے، کمال ہے!!

رات کو جب تسمیہ اپنے بستر پر لیٹی تو اس نے نئے سرے سے اپنے بچوں کے رڈیے کے بارے میں سوچا۔

ایک روز اس نے اپنی تھکی ہاری زندگی کے بارے میں ایک فیصلہ کر لیا اور جب بچوں کو اس فیصلے سے آگاہ کر کے ان کا فیصلہ سننا چاہا تو وہ کشور اجنبی بن گئے۔ یہی بچے گزرے وقتوں میں ہمیشہ اسے کہتے رہتے تھے۔

''جب بھی آپ کو کوئی دل پسند شخص مل جائے، بے شک شادی کر لینا اور اپنی گزری ہوئی زندگی کی تلخیاں اور کرب ناکیاں بھول جانا۔''

ایک موڑ ایسا آیا۔ اس کا دل ایک شخص کے ساتھ راضی ہوگیا۔ یہ جذبات کا فیصلہ نہیں تھا۔ روح کی آواز تھی۔ یہ عمر کا تقاضا نہیں تھا۔ یہ عمروں سے ماورئی کوئی شے تھی جو جانے کتنے جنموں سے چلی ہوئی تھی۔

وہ گھر...... اس گھر کا بچپن کے خوابوں سے میل...... وہ ساری کیفیتیں...... یہ سب ناقابلِ یقین......مگر دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا......؟

وہ اپنے بچوں کو کیسے سمجھاتی...... کہ یونیورس اس کے ساتھ چل رہا تھا...... یا وہ یونیورس کے ساتھ چل رہی تھی...... حالات خود کتاب بن کر ورق اُلٹتے چلے گئے...... اور سب کچھ ہوتا رہا۔

یونیورسٹی کے اشتہار کا چھپنا...... اس کا انٹرویو کے لئے جانا...... پھر امریکہ جا کر عطار صاحب کے گھر ٹھہرنا۔

مافوق الفطرت سہی...... پر سب بے اختیار تھا۔

وہ بے اختیار ان کی طرف کھنچتی چلی گئی۔

اور بقایا زندگی ہے کتنی......

اور اس بقایا تھوڑی سی زندگی کے لئے اس نے کیا اتنا کچھ مانگ لیا تھا کہ بچے برا مان گئے......؟ خود غرض بن گئے...... ناطہ توڑنے کی دھمکیاں دینے لگے۔

اس رات پاکستان میں جب تسمیہ اور تابش نے اسے برا بھلا کہا تھا، وہ ٹوٹا ہوا دل لے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ بستر پر گر کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ بچوں نے اسے کس طرح شرم دلائی تھی۔ اگر وہ ان سے مشورہ کئے بغیر امریکہ میں شادی کر لیتی تو کیا بگاڑ لیتے اس کا......؟

کس طرح بار بار انہوں نے اسے شرمندہ کیا۔ اس کے دل کو بچوں کے طرزِ عمل سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔

صبح اُٹھی تو دل میں درد تھا۔ درمان کو بتایا۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے تمام ٹیسٹ لئے اور بتایا ہلکی سی انجائنا کی تکلیف ہے۔ باقاعدہ دوا لینے اور آرام کرنے سے دُور ہو جائے گی۔ اگر وہ ہسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتیں تو ایک ہفتہ گھر پر ہی آرام کر لیں۔

اگلا سارا دن وہ اپنے بستر پر ہی لیٹی رہی۔ شام کو اپنا سفری بیگ گھسیٹتی تسمیہ اس کے کمرے میں آگئی اور بولی۔

''ماما......! میں ایئرپورٹ جا رہی ہوں۔ آپ کو خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔''

اس نے آنکھیں کھول کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ مگر خاموش لیٹی رہی۔

''دانی کہہ رہا تھا۔ کل رات سے آپ کو انجائنا کی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس عمر میں ایسی تکلیفیں ہی ہوتی ہیں۔ اب آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ اس طرف توجہ دیں۔''

رُکی اور پھر بولی۔

''نوجوانوں کی طرح بیمار پڑنے کے بہانے نہ ڈھونڈیں...... اور نہ اپنی بات منوانے کے لئے انجائنا کا سہارا لیں۔ بہتر ہے بڑھاپے میں شادی کا تردد نہ کریں۔ بلکہ دانی کے لئے کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کر کے اپنی زندگی میں ہی اس کا گھر بھی آباد کر دیں۔ یہ آپ کے فرائض منصبی میں سے ہے۔''

''ہاں......!''

وہ مڑتے مڑتے پھر رُک گئی۔

''تابش کل رات چلا گیا تھا۔ آپ اس وقت غالباً ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ جاتے ہوئے وہ آپ کو خدا حافظ کہہ گیا تھا۔''

کھٹ سے وہ باہر نکل گئی۔

تسمیہ کو اپنی ذات سے شرم آنے لگی۔ اپنی اوقات سے شرم آنے لگی۔ اپنی مامتا سے شرم آنے لگی۔

وہ اتنی بے مایہ اور بے مول کیوں ہوئی......؟

کہ وہ اپنے بچوں کی نظروں میں گر گئی۔ نظروں سے گرنا بہت بڑی

ذلت ہے۔ اس ذلت کو سہہ کر وہ کیسے ان کے درمیان میں رہ سکے گی۔

دنیا بھر میں بیوہ اور طلاق شدہ عورتیں دوسری شادی کر لیتی ہیں۔ مذہب ان کو اجازت دیتا ہے۔ وہ بھی جن کے بچے جوان ہوتے ہیں، عرب دنیا میں تو ایک عورت کئی بار شادی کر سکتی ہے۔ پھر اس نے کیا گناہ کیا تھا......؟

پھر وہ تو ان بچوں کی بار بار کی شہ پر اس تمنا کا اظہار کر بیٹھی تھی۔

اگر وہ امریکہ میں شادی کر کے ان کو اطلاع دیتی تو یہ کیا کر لیتے......؟

کئی دن تک وہ شرمندگی کے مارے بستر پر پڑی رہی۔

اس کا دل چاہتا وہ کسی طرح ان بچوں کی نظروں سے دُور ہو جائے ۔کبھی ان کا سامنا نہ کرے۔ جن کا ہر خواب اس نے ہر قیمت پر پورا کیا تھا۔

ایسے رشتوں میں کیا سارے فرائض منصبی ماں کے لئے ہی ہوتے ہیں......؟

جب تسمیہ نے ایک مراکو لڑکے سے شادی کرنی چاہی تو اس نے فوراً اجازت دے دی۔

جب تابش نے بغیر تعلیم مکمل کئے غیر مذہب کی لڑکی سے شادی کرنی چاہی۔ اس نے مخالفت نہیں کی۔

اپنی حیثیت سے زیادہ دے دلا کر یہ دونوں شادیاں کر دیں۔ بچوں کی خوشیوں کے درمیان وہ دیوار نہیں بنی تھی۔ بلکہ ڈھال بن کر کھڑی ہوگئی تھی۔

اب یہ وہی بچے ہیں جنہوں نے اس کے آگے انا کی اتنی بڑی دیوار بنا دی تھی۔

اگرچہ درنان باقاعدہ اس کا ساتھ دے رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔

''ماما......! آپ عطار صاحب سے شادی کر لیں۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ آپ ان دونوں کی پرواہ نہ کریں۔ یہ دونوں حد درجہ خودغرض بن رہے ہیں۔''

مگر اس کا دل دُنیا سے بے زار ہو گیا تھا۔

ہر رشتے سے اس کا اعتماد اُٹھ گیا تھا۔

آتے وقت جب وہ عطار صاحب کے ساتھ موٹر میں بیٹھی تھی۔ اس نے اس خدشے کا اظہار کر دیا تھا۔

دھیمے دھیمے لہجے میں اس نے کہا تھا۔

''عطار صاحب......! میں اس وقت ساٹھ سال کی ہو چکی ہوں اور آپ پینسٹھ کے ہو چکے ہیں۔ یہ شادی کی عمر نہیں ہوتی۔ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح مل کر اپنے مشن کی تکمیل کرتے رہیں۔''

تو انہوں نے رسان سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''تسبیح......! کوئی خوف تمہارے اندر ابھی تک بولتا ہے۔ محبت اور شادی کی عمر کا تعین کبھی نہیں ہو سکا۔''

''یہ درست ہے کہ عموی طور پر لوگ جوانی میں محبت اور جوانی میں ہی شادی کرتے ہیں۔ جوانی کی محبت ایک قسم کی جسمانی کشش اور نفسانی ضرورت بن جاتی ہے جو خواہش اور خواب کا روپ بدل بدل کر زندگی میں

آتی ہے۔ اس میں بچوں کی تمنا، گھر کا سکھ، عزیز و اقارب سے میل جول اور
حتیٰ کہ سارا معاشرہ شامل ہو جاتا ہے۔‘‘

’’لیکن ان ارضی و نفسی خواہشات سے ماورئی ہو کر ایک روحانی محبت
بھی ہوتی ہے۔ ایک روحانی محبت اور کلیتہً رومانی محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے
اور اس فرق کا احساس اوائل عمر گزر جانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ یہ وہ محبت
ہے جو لیل و نہار کی جکڑ بندیوں سے آزاد اپنے آپ میں زندہ رہتی ہے۔ جو
ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے ہونے کا جواز عطا کرتی ہے۔ جنم جنم کی
تھکاوٹ اُتار دیتی ہے۔ راستوں کو منور کر دیتی ہے۔‘‘

’’محبت آخر ہے کیا......؟‘‘

’’ایک دائمی رفاقت کا نام...... جو کسی بھی ملے میں عطا کی جاتی
ہے۔ ہمیں اس مقام پر ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اس رفاقت کی
ضرورت ہے۔ محض اس لئے کہ زیادہ عمر گزر چکی ہے اور تھوڑی رہ گئی ہے۔ ہم
اس خواہش کی نفی کر دیں۔ باقی جتنا عرصہ بھی ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ
نصیب ہو، ہماری خوش نصیبی ہے۔‘‘

’’اور کچھ نہیں تو شام کو سونے سے پہلے آتش دان کے پاس بیٹھ کر
خوب صورت باتیں کرنے اور سننے کو تو ہر عمر میں جی ترستا ہے۔‘‘

’’ذرا میری اور اپنی ملاقات کی کڑیاں ملا کر دیکھو۔ کب سے چلے
ہوئے ہیں ہم ایک دوسرے کی تلاش میں اور اب اس موڑ پر آ کر ملے ہیں۔
جب ہماری راہ میں بظاہر کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔
قدرت کا منشاء بھی یہی ہے۔ فضول قسم کے وسوسوں میں وقت ضائع

نہ کرو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں ایک پل بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے اور
شادی کر لینی چاہئے۔‘‘

ان کی ایسی باتیں سن کر وہ پگھلنے لگی تھی۔

آسمانوں پر پرواز کرنے لگی تھی۔

لیکن دونوں بچوں نے جیسے اسے آسمان سے زمین پر دے مارا تھا۔

ایک ماہ کی ذہنی کشمکش اور دلی اذیت کے بعد اس نے ایک فیصلہ کر
لیا اور ورمان سے کہا۔

’’بیٹا......! میرا ڈپریشن کم نہیں ہو رہا۔ میں عمرہ کرنے کے لئے
جانا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔ اس نے کہا تھا اب میں
بالکل صحت مند ہوں۔ سفر کر سکتی ہوں۔‘‘

’’ضرور جائیں ماما......!‘‘

ورمان کو پتہ تھا۔ ہجوم یاس و اضطراب میں اس کی ماں ہمیشہ عمرہ پر
جانے کی خواہش کرتی تھی اور پھر وہاں سے ٹھیک ٹھاک ہو کے واپس آجاتی
تھی۔

’’مگر میرے تو آج کل فائنل ایگزام ہو رہے ہیں۔ میں آپ کے
ساتھ نہیں جا سکتا۔ آپ کا محرم کون ہوگا......؟‘‘

’’میرا کزن ہے نا...... زین العابدین......! وہ اپنے بیوی بچوں کے
ساتھ عمرہ کرنے جا رہا ہے۔ اس کی سالی نمرہ جدّہ میں رہتی ہے۔ میں ان
کے ساتھ شامل ہو جاؤں گی۔ آج ہی بات کرتی ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے......! آپ اپنا پاسپورٹ دیں۔ میں ویزا لگوا دیتا

ہوں۔“

درمان نے اس کے سارے انتظامات مکمل کروا دیئے تھے۔ احتیاطاً ایک بار اور ڈاکٹر کو دکھا دیا تھا۔ دوائیاں بھی لے دی تھیں۔ بار بار کہتا۔

”وہاں سے مجھے روز فون کرنا ماما......!“

عمرہ پر جانے سے پہلے اس نے اپنے سارے ذاتی کاغذات و اثاثے ترتیب سے الماری میں رکھ دیئے۔

ان پر حسب عادت ہدایات بھی لکھ دیں اور پھر آتے ہوئے الماری کی چابی درمان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”دانی......! یہ میری بہت ضروری اور ذاتی الماری ہے۔ تمہارے سوا اسے کوئی نہ کھولے اور اس کے اندر میرے بینک کے لاکر کی چابی بھی ہے۔ یاد رکھنا اس لاکر میں تمہاری شادی کے لئے زیورات بھی رکھے ہوئے ہیں۔ وہ صرف تمہاری بیوی کے ہیں۔“

”ماما......! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ......؟ میں نہیں لیتا یہ چابیاں...... جب خیر سے آپ واپس آجائیں گی تو پھر خود ہی سب کچھ دیکھتی پھرنا۔“

”بیٹا......! میری جان......! دانی......! سفر میں جاتے وقت یہ سب احتیاط کرنا پڑتا ہے۔ ابھی تم سنبھالو......! میں خود آکر تم سے چابیاں لے لوں گی۔“

لیکن اس نے دل میں کچھ اور ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ آخری فیصلہ...... اور مضبوط فیصلہ۔

عمرہ کے بعد رات کو ہی اس نے درمان کو تفصیلی فون کر دیا تھا۔ اُصولاً اپنی دونوں بہنوں سے فون پر بہت سی باتیں کر لی تھیں۔ مگر بچوں کے ساتھ اپنی بدمزگی والی بات انہیں نہیں بتائی تھی۔ ممکن ہے وہ بھی ذہنی طور پر اس بات کو قبول نہ کریں اور بچوں سے بھی زیادہ اس کی دلآزاری کرنے لگیں۔

❀ ❀ ❀

جب ساری دُنیا سوگئی اور گھر میں ہو کا عالم ہوا تو تسبیحہ نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور لکھنے لگی۔

''عطار صاحب......!

تسلیمات......!

آپ کو میرے خط اور پروگرام کا انتظار ہوگا۔ کیونکہ میں آپ سے کہہ کر آئی تھی کہ اب میں ہی آپ کو اطلاع دوں گی۔

گھر آئی اور یہاں آکر میں قول ہار گئی۔ اس ایک مہینے نے ہمارے درمیان ایک صدی کو حائل کر دیا۔

اللہ کے واسطے میرا کہا سنا معاف کر دیجئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی اسی رات مکمل ہوگئی تھی جب میں آپ کے کاندھے پر سر رکھ کر بے اختیار سوگئی تھی۔ وہ رات میری ہر آرزو سے بڑی تھی اور وہ لمحہ میرے لئے حاصل زندگی تھا۔

اس ایک رات کے بعد مجھے کچھ اور طلب کرنے کی تمنا نہیں ہونی چاہئے تھی۔

وہیں پر میری سانسیں رُک جاتیں تو اچھا تھا۔

انتہا کے بعد ابتداء کی تمنا کرنا نادانی ہے۔

میرا دوسرا خیال غلط نکلا۔

بچوں نے میری شادی کو قبول نہیں کیا۔ اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ بچوں کا کیا ہے؟ بچے تو خودغرض ہوتے ہیں۔ جلد باز ہوتے ہیں۔

مگر میں ایسا نہیں کہہ سکتی۔

میرا ایمان یہ ہے کہ

ماں ساری زندگی بچوں کی خاطر ایک جہنم میں گزار دیتی ہے۔ صلے کی تمنا کے بغیر...... کیوں......؟

صرف اس لئے کہ دُنیا سے اس کے جانے کے بعد بچے اسے اچھے لفظوں میں یاد کر سکیں۔ دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائیں...... اور اسے ایک بہترین ماں کے طور پر دل میں بسائے رکھیں۔

اس کے علاوہ کسی ماں کی اور تمنا بھی کیا ہو سکتی ہے......؟

یوں سوچئے گا دُنیا کے میلے میں اچانک میں آپ کو مل گئی تھی اور دنیا کی بھیڑ میں اچانک گم ہوگئی ہوں۔

آپ کا کام ہر تمنا سے بڑا ہے۔ اس کو کبھی نہ بھولیئے گا۔

ان دنوں، ان راتوں، ان لمحوں، ان باتوں کی قسم......!

مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔

آخری سلام......! تسبیح...... جو بکھر گئی۔''

خط لکھ کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا اور وہ سوگئی۔

صبح جب وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تو شیخ عبدالعزیز کا فون آگیا۔

انہوں نے کہا۔

''یا اختی......! میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوں۔ آپ تشریف لے آئیں اور ضروری باتیں بھی کر لیں۔''

وہ ایک نئے ولولے اور ارادے سے کھڑی ہوئی۔ سر پر اپنی چادر درست کی اور اللہ سے دُعا مانگی کہ اس کے ارادے کی تکمیل ممکن ہو۔

ایک انوکھی خواہش اس کے دل میں ہمیشہ اُٹھتی تھی۔ وہ جب کبھی عمرہ کرنے کے لئے آتی اور مسجد نبویؐ میں حاضری دیتی۔ وہاں برقعہ پوش خواتین کو دن رات حرم شریف کے اندر فرش اور دیواریں صاف کرتے ہوئے دیکھتی۔ اگرچہ یہ عورتیں، عورتوں والے حصہ میں ہی کام کرتی تھیں مگر اپنا چہرہ ہمیشہ نقاب سے ڈھک کے رکھتی تھیں۔ وہ بڑی محویت اور عقیدت سے تنکا تنکا چن لیتیں۔ قالین جھاڑ کر بچھا دیتیں۔ فرش کی ایک ایک اینٹ چمکا دیتیں۔ دیواروں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی رہتیں۔ زم زم سے بھرے ہوئے برتن اِدھر اُدھر لگاتیں۔ بچے اور عورتیں فرش پر زمزم بے دردی سے گرا جاتے۔ وہ کبھی نہ جھڑکتیں۔ ہمیشہ ہروقت مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے میں جتی رہتیں۔ کون آرہا ہے......؟ کون جا رہا ہے......؟ انہیں کسی سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔

ایک بار جب وہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے آئی ہوئی تھی۔
ایک عورت کو اُردو بولتے سن کر اسے قریب بلا لیا اور کچھ ریال دیئے۔

اس نے شکریہ ادا کیا تو تسبیحہ نے پوچھ لیا۔

''کس ملک سے آئی ہو......؟''

وہ بولی۔

''بنگلہ دیش سے۔''

''یہ ملازمت تم نے کس طرح حاصل کی......؟''

اس نے پوچھ لیا۔

''بس جی......قسمت سے مل گئی۔''

''پھر بھی یہاں تک آنے کا کوئی طریقہ تو ہوگا ہی......؟''

اس نے مزید بتایا۔

''ہم اپنی عرضی اپنے سفارت خانے کو بھیجتے ہیں۔ جو یہاں سعودی عرب میں تعینات ہوتا ہے۔ وہ ہمارے کاغذات تصدیق کر کے سعودی سفارت خانے کو بھیج دیتا ہے۔ اس طرح مکمل جانچ پڑتال اور ضمانت کے بعد ہمیں ایک سال کا اقامہ اور نوکری مل جاتی ہے۔ کوئی دوبارہ آنا چاہے تو اسے سال بعد نئے سرے سے عرض دینی پڑتی ہے۔''

''بڑی خوش نصیب ہو۔ مسجد نبویؐ میں کام کرتی ہو۔''

تسبیحہ نے رشک سے کہا۔

''کچھ عورتیں ہمیں حقارت سے دیکھتی ہیں۔ کہتی ہیں صفائی والیاں ہیں۔''

''میں تو تمہاری قسمت پر رشک کرتی ہوں۔ یہ زمین تو ایسی ہے کہ ہمیں اپنی پلکوں سے جھاڑو دینا چاہئے اور سانسوں سے فرش صاف کرنے چاہئیں۔ یہاں صفائی کرنا ہی زندگی کی معراج ہے۔''

''بس باجی......! کہنے کی باتیں ہیں۔''

وہ عورت اتنا کہہ کر باہر نکل گئی۔

تب اس نے دل میں کئی بار سوچا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے یہ کام کرنا چاہیے۔ دنیا میں اس سے اچھا کوئی کام نہیں ہے۔

پچھلے کئی دنوں سے اس کی اس پرانی خواہش نے اسے بے کل کر رکھا تھا۔ اس کے سوا اسے کوئی اور راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو شیخ عبدالعزیز کھڑے ہو گئے۔

وہ آ کر پاس بیٹھ گئی۔ ساتھ ان کی بیگم بھی آ گئی تھی۔

تسبیحہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''یا اخی......! آپ ہمیشہ مجھے کہا کرتے ہیں کہ میں آپ کا سگا بھائی ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔''

''ہاں ہاں...... اختی......! اس میں شک نہیں۔ آپ حکم کر کے دیکھیں اور پھر مجھے آزمائیں۔''

اس نے دیر نہیں لگائی اور اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

شیخ عبدالعزیز ہکا بکا رہ گئے۔ پھر بولے۔

''یا اختی......! آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل فخر تدریسی کیریئر رکھنے کی حامل خاتون ہیں۔ اب بھی آپ کو سعودی عرب کی یونیورسٹیوں میں بڑی سے بڑی ملازمت مل سکتی ہے۔ کئی پرائیویٹ تعلیمی ادارے آپ کے تجربات کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہو جائیں گے اور آپ مسجد نبویؐ میں صفائی کرنے اور فرش صاف کرنے کی ملازمت کے لئے میری سفارش کرانا چاہتی ہیں......؟''

''بس اخی......!''

تسبیحہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''میری زندگی کی آخری خواہش یہی ہے اور یہ کام میں بغیر تنخواہ کے کرنا چاہتی ہوں۔ آپ بتائیں آپ اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں یا میں خود کوشش کروں......؟''

''کمال ہے......!''

وہ ہنسنے لگے۔

''آپ پاکستانی بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ آپ تو کسی سرکاری محکمے میں Adviser بھی لگ سکتی ہیں۔''

''بس جھاڑو لگاؤں گی حرم شریف میں...... فرش صاف کروں گی...... تنکے چنوں گی...... بس...... اور کچھ نہیں......!''

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ اس کی اس کیفیت کے سامنے شیخ عبدالعزیز خاموش ہو گئے اور پھر بولے۔

''آپ کی یہی خواہش ہے تو یہ کام ہفتے کے اندر ہو جائے گا۔ صبح میں آپ کی عرضی دے دوں گا۔ آپ کو ملازمت مل جانے کے بعد ہم مدینہ منورہ روانہ ہوں گے۔''

''شکریہ یا اخی......!''

وہ آنسو پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ بھی کھڑے ہو گئے اور بولے۔

''مگر ایک بات یاد رکھئے گا۔ آپ کے بھائی کا گھر یہاں موجود

ہے۔ یہاں آتی رہنے گا۔"

"ایک اور وعدہ کریں یا اخی......!

سال بھر میں میرے بچوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں......؟"

"یا اختی......؟"

وہ چیخے۔

"آپ کو قسم ہے یا اخی......!قسم میری چادر کی......!"

❁ ❁ ❁

فائنل امتحان دینے کے بعد درمان ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ جب پاکستان پر زلزلے کی صورت میں ایک ایسا عذاب نازل ہوا جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایسی تباہی کہ جس نے دیکھی، توبہ و استغفار کرنے لگا۔ خاص طور سے آزاد کشمیر کا پورا پہاڑی علاقہ زمین بوس ہوا۔ پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ زمین شق ہوئی۔ زندہ انسان درگور ہوئے۔ ڈھونڈنے والے چیختے چلاتے رہ گئے او پوری فضائیں نالہ وشیون سے بھر گئیں۔

ایسے میں سارے پاکستانی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دامے، درمے، سخنے، قدمے...... جس کے پاس جو توفیق، لے کر چل پڑا۔ بین الاقوامی امداد بھی دھڑا دھڑ پہنچنا شروع ہوگئی۔

ٹی وی پر بار بار نئے و پرانے ڈاکٹروں کو اپیل کی جا رہی تھی کہ تباہ حال اور زخم زخم لوگوں کی امداد کے لئے رضا کارانہ طور پر پہنچیں۔

ایک شام درمان اور اس کے دوستوں نے فیصلہ کیا اور اگلی صبح آزاد کشمیر پہنچ گئے اور اپنی خدمات پیش کر دیں۔

دن رات کے عرصے میں انہیں اتنی لاشیں اٹھانی پڑتی تھیں کہ وہ زندوں کو بالکل بھول گئے۔

ہر روز اتنی آہ و بکا سننی پڑتی تھی کہ خود اپنے دل کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ ایک جذبہ تھا، جنون تھا، لگن تھی، ہمدردی تھی۔ دردِ دل تھا کہ بوڑھے سے لے کر نوجوانوں تک کو لئے پھرتا تھا۔ تباہی تھی کہ پھیلتی جا رہی تھی۔ کراہیں تھیں کہ سمیٹی نہ جا رہی تھیں۔

وہ لوگ ایک کیمپ سے دوسرے میں جاتے۔ دوسرے سے تیسرے میں جاتے۔ کہیں آپریشن ہوتا، کہیں ہڈیاں جوڑی جاتیں، کہیں زخم بھرے جاتے۔

کسی کا دل آرام کرنے کو نہ چاہتا۔ بس کھانا بھی ضرورت کے تحت کھا لیتے۔

دو ماہ کے بعد ذرا حالات بہتر ہوئے تو درمان کو ہوش آیا۔ پتہ نہیں اس کا لیپ ٹاپ کس شامیانے میں رہ گیا تھا۔ تھوڑے سے کپڑے جو ساتھ لایا تھا، پتہ نہیں کس خیمے میں رکھ دیئے تھے۔ موبائل فون بھی جیب سے گر گیا تھا۔

روزانہ سوچتا کسی سے فون مانگ کر گھر والوں کو اطلاع دے گا۔ ماں کو اطلاع دے گا۔ بھائی اور بہن کو ساری تفصیل بتائے گا مگر زمین پر بکھرے ہوئے کھلونوں کی طرح ٹوٹے پھوٹے ہوئے انسان اس کی توجہ اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ بھی اور لوگوں کی طرح رشتوں ناطوں سے بے نیاز ہوا پڑا تھا۔

بڑھ بڑھ کر کام کر رہا تھا۔ ہر جگہ پہنچ جاتا تھا۔ مگر اسے برابر اپنی ماں کا دھیان رہتا تھا اور اسے یقین تھا جب اس کی ماں کو معلوم ہوگا کہ وہ

خدمت خلق کے ایک اعلیٰ ترین کام میں لگا ہوا تھا تو اس کی ماں بہت خوش ہوگی۔

تین ماہ کے بعد ذرا حالات معمول پر آئے تو اسے کسی قمیص کی جیب سے اپنا گمشدہ موبائل بھی مل گیا۔

اسے چارج کر کے اس نے چلایا تو ماں کی طرف سے ایک ایس ایم ایس آئی ہوئی تھی کہ میں عمرہ کرنے کے بعد ایک نئی دُنیا دیکھنے جا رہی ہوں۔ فکر نہ کیا جائے۔ خود ہی واپسی کی اطلاع دوں گی۔“

اگرچہ پیغام اتنا واضح نہیں تھا پھر بھی اس نے یہی سمجھا کہ ماما ورلڈ ٹور پر نکل گئی ہیں۔ کبھی کبھی وہ کہا کرتی تھیں۔

”دانی.....! میں نے بہت کام کر لیا ہے۔ اب میرا دل چاہتا ہے کچھ نہ کروں۔ بس اللہ کی دُنیا دیکھنے نکل جاؤں۔“

وہ کہتا۔

”ماما.....! دم لو..... میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

”ابھی تمہاری عمر سیر سپاٹے کی نہیں ہے۔ پہلے اچھے اچھے کام کرو۔“

تو وہ ماما کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے اچھے اچھے کام کرنے کی ابتداء کر دی ہے۔

گھر آتے اس کو نوید ملی کہ جتنے نوجوان ڈاکٹروں نے زلزلے کے دوران دن رات ملی وقومی خدمات رضا کارانہ طور پر ادا کی ہیں ان کو سرکاری ہسپتالوں میں جاب دیئے جائیں گے۔

اسے سرکاری ہسپتال میں جاب مل گیا۔

اگلے دو مہینے میں وہ اچھی طرح سیٹل ہوگیا۔

لیکن اس دوران ماں کی طرف سے اور کوئی سگنل نہیں آیا۔

اس نے احتیاطاً شیخ عبدالعزیز سے فون پر بات کی۔ جسے سارے بچے عمو جان کہا کرتے تھے۔ یا ماموں جان بھی کہہ دیتے تھے۔

ماموں جان نے بس عجیب سا جواب دیا کہ عمرہ کرنے کے بعد وہ یہاں سے چلی گئی ہیں۔

چھ مہینے گزر گئے تو درمان پریشان ہوگیا۔

اس نے تسمیہ اور تابش کو فون کرنے شروع کر دیئے۔

آہستہ آہستہ ان دونوں کو بھی فکر ہوا کہ ماں اتنے لمبے عرصے کے لئے تو کبھی جاتی نہیں۔

ایک دن درمان فون پر بہت رویا تو تسمیہ اور تابش پاکستان آگئے۔

تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

پھر انہوں نے سوچا کہ عطار صاحب سے کیوں نہ پوچھ لیا جائے کہ ماما کہاں ہیں....؟

اگرچہ انہیں ڈر بھی لگتا تھا اور یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا پوچھیں....؟ اور کس طرح پوچھیں....؟

تاہم ایک روز درمان نے انہیں فون کر ہی دیا۔

انہوں نے کہا۔

''ان کا ایک خط آیا تھا میرے پاس.... کوئی آٹھ ماہ پہلے.... اور انہوں نے کام کرنے سے معذرت کر لی تھی.... اور رابطہ کرنے سے بھی منع

کیا تھا۔''

یہ سن کر تو تینوں کی جان نکل گئی۔

''کہیں ماما نے خودکشی نہ کر لی ہو....؟''

تابش بولا۔

''ہم نے اس دن ان کی بے عزتی بہت کی تھی۔''

''نہیں....!''

تسمیہ روتے ہوئے بولی۔

''ماما.... خودکشی نہیں کر سکتیں۔ وہ ہم سب سے روپوش ہو کر کوئی کام کر رہی ہیں۔''

''تسمیہ....! تم نے ماما کو بڑی نامناسب باتیں کہی تھیں۔''

تابش بولا۔

''ہاں ہاں....! اب سارا الزام مجھ پر ڈال دو.... تم نے تو جیسے کچھ نہیں کہا تھا.... تم تو انہیں خدا حافظ کہے بغیر چلے گئے تھے۔''

تسمیہ چیخ کر بولی۔

''آپا....! یہ لڑنے کا وقت نہیں ہے۔''

درمان بولا۔

''بیٹھ کر تسلی سے سوچو....! اب کیا کرنا چاہئے....؟ ورنہ میں خود ورلڈ ٹور پر نکل جاؤں گا اپنی ماما کو ڈھونڈنے۔''

''دانی....!''

تسمیہ کہنے لگی۔

''دانی......! ہم نے اپنی اتنی اچھی ماما کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا...... لعنت ہے ہم پر...... انہوں نے ساری زندگی ہماری خوشیوں پر قربان کر دی...... اور ہم...... ہم اتنے کمینے اور خودغرض ہو گئے......؟''

تسمیہ پھر رونے لگی۔

''ایک تو آپا......! تم رو رو کر ہمارا دماغ خراب کر رہی ہو۔''

تابش بولا۔

''تسلی سے کچھ سوچنے دو......!''

''اشتہار چھپوا سکتے ہیں مگر اس سے ماما کی پوزیشن خراب ہو جائے گی...... جو تھوڑے بہت رشتے دار ہیں...... بار بار ان کے ہاں جانے سے شکوک و شبہادت بڑھیں گے۔ ابھی تو ہم سب سے کہہ رہے ہیں کہ عمرہ کرنے گئی تھیں...... کچھ دنوں کے لئے وہیں رہ گئی ہیں۔''

تابش نے کہا۔

''مدیحہ خالہ اور ملیحہ خالہ بھی پریشان تھیں۔ حیرت ہے ماما ان کے ہاں نہیں گئیں۔ ورنہ عمرے کے بعد وہاں ضرور جایا کرتی تھیں۔''

تسمیہ نے تردّد سے کہا۔ درمان سر جھکائے بیٹھا رو رہا تھا۔

یکا یک اس نے سر اُٹھایا اور چلایا۔

''آئیڈیا......!''

''کیا آئیڈیا......؟''

وہ دونوں بھی چیخے۔

''ماما اپنی ذاتی الماری کی چابیاں مجھے دے گئی تھیں۔''

''پھر......؟ چابیاں تو وہ ہمیشہ ہی تمہیں دے کر جاتی تھیں۔''

''نہیں......! اس مرتبہ انہوں نے باتیں اور طرح کی کہی تھیں۔''

''تو پھر...... لاؤ نہ چابی...... الماری کھول کر دیکھتے ہیں۔'' تسمیہ بولی۔

''ہاں......! جلدی لاؤ......!''

تابش بھی کھڑا ہو گیا۔

درمان دوڑ کر اپنے کمرے میں گیا اور چابی لے آیا۔

❁ ❁ ❁

تینوں نے بے تابانہ تجسس کے ساتھ الماری کھول دی۔ ہمیشہ کی طرح تمام کاغذات، ڈائریاں اور ماما کی جیولری جو کہ وہ روزمرہ پہنتی تھیں، بڑے سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی۔

غور سے دیکھا تو ہر چیز کے اوپر ایک چٹ پڑی تھی۔ انہوں نے آرام سے چٹیں اُٹھا کر پڑھنا شروع کیں۔

ماما سونے کی بارہ چوڑیاں ہر وقت پہنے رکھا کرتی تھیں۔ ان کو پلاسٹک کے بیگ میں ڈال کے اس کے اندر ایک چٹ رکھی تھی جس پر ماما نے لکھا تھا۔

''جب تسمیہ کی بیٹی تاباں کی شادی ہو تو یہ چوڑیاں میری طرف سے اسے دے دی جائیں۔''

دوسرے لفافے میں ایک ماما کی ڈائمنڈ کی انگوٹھی رکھی تھی۔ اس پر چٹ رکھی تھی جس پر لکھا تھا۔

''یہ انگوٹھی تسمیہ کے بیٹے تجمل کی شادی پر اس کی بیوی کو میری طرف سے دے دی جائے۔''

دوسرے پلاسٹک کے لفافے میں ماما کا ڈائمنڈ والا لاکٹ جس کے

درمیان اللہ لکھا ہوا تھا، پڑا تھا اور اس کے ساتھ ٹاپس اور انگوٹھی بھی تھی۔ اس لفافے کی چٹ پر لکھا تھا۔

''یہ میرا سیٹ تابش کی بیٹی مہ وش کی شادی پر اسے دے دیا جائے۔''

اسی طرح سچے موتیوں کی ایک مالا جس لفافے میں رکھی تھی، اس پر لکھا تھا کہ

''یہ مالا تابش کے بیٹے کاوش کی شادی پر اس کی بیوی کو میری طرف سے دے دی جائے۔''

آگے گھر کی رجسٹری کے کاغذات تھے۔ جن پر لکھا تھا۔

''یہ گھر تینوں بچوں کے نام ہے۔ شرعی طریقے سے تقسیم کر لیں۔''

پھر ایک چیک بک رکھی تھی۔ جس کے اندر تینوں بچوں کے نام کراس چیک لکھے گئے تھے۔ جن پر تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ چٹ پر لکھا تھا۔

''اپنی ضرورت کی رقم نکال کر باقی ساری جمع پونجی یہی ہے۔ آپ تینوں آپس میں تقسیم کر لینا اور رقم چیک پر درج کر لینا۔''

ایک اور چٹ پر نظر پڑی۔ اس پر لکھا تھا۔

''یہ میرے لاکر کی چابیاں ہیں۔ لاکر کے اندر دو طلائی سیٹ پڑے ہیں۔ یہ دونوں سیٹ اُصولاً درمان کی دُلہن کے ہیں۔ اس کو دے دیئے جائیں۔

باقی جو بھی چیزیں اس گھر میں ہیں۔ میرے بچے اگر اس میں سے نشانی کے طور پر کچھ رکھنا چاہیں تو رکھ لیں ورنہ ساری چیزیں غریبوں میں تقسیم

کر دی جائیں۔"

ان تینوں نے بار بار ان چٹوں کو پڑھا۔ ان چیزوں کو دیکھا۔ ماما کی الماری کے اندر سے ابھی تک ماما کی خوشبو آ رہی تھی۔ اندر وہ تمام تحفے پڑے تھے جو تینوں بچوں نے گاہے بگاہے ماما کو دیئے تھے۔ سب کچھ اچھی طرح دیکھ چکنے کے بعد ان تینوں نے خالی خالی اور شرمندہ شرمندہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

یکا یک انہیں اتنی عظیم ماں کو کھو دینے کا احساس ہوا۔

پھر تینوں ایک دوسرے سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگے۔

کافی دیر تک روتے رہے۔

پھر درمان نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اور بولا۔

"آپا......! بھیا......! چپ کر جاؤ......! اس طرح رونا بدشگونی ہے۔ الماری اسی طرح بند کر دو۔ آؤ ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنی ماما کو ڈھونڈ کر رہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے ہماری ماما زندہ ہے اور ایک دن ہمیں مل جائے گی۔"

"آمین......! آمین......!"

تابش اور تسمیہ نے بھی کہا۔

پھر انہوں نے ہر چیز اپنی جگہ پر رکھ کر اسی طرح الماری بند کر دی۔

دن بھر اپنی اپنی جگہ پر وہ سوچتے رہے۔

رات کو جب اکٹھے ہوئے تو درمان نے ہی مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں ہمیں عطار صاحب سے مدد کی درخواست کرنی چاہئے۔ وہ ضرور کوئی تدبیر

سوچیں گے۔

اسی وقت انہوں نے امریکہ میں عطار صاحب کو فون کر کے بات کی۔ تینوں نے باری باری اپنے جذبات کا اظہار کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس ضمن میں ان کی رہنمائی فرمائیں۔ اور انہیں پاکستان آنے کی دعوت بھی دی۔

عطار صاحب نے بڑی توجہ اور محبت سے ان کی سب باتیں سنی۔ وہ خود تسمیہ کے ایسے پُراسرار سے خط سے پریشان تھے۔ انہوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ اگلے ہفتے پاکستان اسی مقصد کے لئے آئیں گے۔

تسمیہ اپنے دونوں بچوں کو اپنے شوہر حنان بن کریم القدیم کے پاس چھوڑ کر آئی تھی اور تابش سب کچھ اور بچے جولیانہ کے سپرد کر کے آ گیا تھا۔

انہوں نے اپنے اپنے پارٹنر کو حقیقت حال سے تو آگاہ نہیں کیا تھا مگر اتنا بتا دیا تھا کہ کوئی خانگی پریشانی ہے جس کی وجہ سے ابھی وہ واپس نہیں آ سکتے۔

درمان تو ماما کے ساتھ جا کر کئی بار عطار صاحب کو مل چکا تھا۔ مگر تابش اور تسمیہ نے صرف ان کی باتیں سنی تھیں۔ نہ ملے تھے نہ دیکھا تھا۔

لیکن نامعلوم کیوں ماما اور درمان سے ان کی اتنی تعریفیں سن کر ہی ان دونوں کو ایک انجانا سا حسد محسوس ہونے لگا تھا۔ خواہ مخواہ ان کے نام سے بدکنے لگے تھے۔

بلکہ گھر میں ان کا نام بھی سننے کے روادار نہیں تھے۔

اگلے ہفتے وعدے کے مطابق عطار صاحب پاکستان آ گئے۔ انہوں

نے اپنی آمد کی اطلاع دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس ملاقات کے لئے وہ خود چل کر ان کے گھر آئیں گے اور تفصیلی بات چیت سنیں گے۔

تسمیہ چونکہ بڑی تھی۔ اس لئے ان کو اس نے رات کے کھانے کی دعوت دے دی۔ انہوں نے کہا کہ رات آٹھ بجے وہ ان کے گھر خود بخود پہنچ جائیں گے۔

❀❀❀

عطار صاحب نے ٹھیک آٹھ بجے آ کر بیل بجائی تو لاؤنج میں اس وقت صرف تسمیہ ہی موجود تھی۔ بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

وہ سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

کیا خوب صورت شخصیت تھی۔ دیوتاؤں کی طرح صاف ستھری...... چہرہ روشن...... آنکھیں بولتی ہوئی...... مناسب لباس۔

وہ تو واقعی پرانے وقتوں کے بادشاہوں کی طرح بارعب اور دل میں اُتر جانے والی شخصیت کے مالک تھے۔

''تسمیہ بیٹی......!''

وہ مسکرا کر بولے۔ انہوں نے مبہوت کھڑی تسمیہ کو چپ دیکھ کر خود ہی کہا۔

''اوہ...... جی...... السلام علیکم...... جی جی...... میں تسمیہ ہوں۔''

تب تسمیہ کو سلام کرنا یاد آیا۔

''اندر تشریف لائیے......!''

وہ اندر آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

تسمیہ نے آواز دے کر تابش اور درمان کو بلا لیا اور خود مشروب لینے

چلی گئی۔

باتیں شروع ہوئیں تو وہ تینوں ان کی گفتگو کے سحر میں کھو گئے۔ بار بار انہیں ماما یاد آتیں کہ کاش وہ آج یہاں موجود ہوتیں۔

تسمیہ نے یہ بات کہہ بھی دی اور رو بھی پڑی۔

انہوں نے اسے بہت تسلی دی اور بولے۔

''آج ہم اسی کارن اکٹھے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ.....! کوئی حل نکل آئے گا۔''

تسمیہ اُٹھ کر کچن میں گئی۔ پھر آ کر بولی۔

''اگر آپ پسند کریں تو پہلے کھانا کھا لیں۔ پھر باتیں کرتے رہیں گے۔''

''انتہائی مناسب.....!''

انہوں نے کہا اور کھڑے ہوگئے۔

کھانا بہت پُرتکلف تھا۔ انہوں نے تسمیہ کے سلیقے کی بہت تعریف کی۔ انہوں نے ایسی نہج پر گفتگو کا آغاز کیا تھا کہ تینوں کی طبیعت کو سمجھ گئے۔

کھانے کے بعد وہ سب پھر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

انہوں نے اپنے کمپیوٹر میں سے ایک خط نکال کر ان تینوں کو دیا کہ وہ باری باری پڑھ لیں۔ یہ وہ آخری خط تھا جو تسمیہ نے انہیں سعودی عرب سے لکھا تھا۔

اس خط کا متن پڑھ کر تینوں بچے پھر باری باری روئے۔

''سر.....! میں قصور وار ہوں۔''

تسمیہ نے کہا۔

''نہیں سر.....! قصور میرا بھی ہے۔ میں نے بڑی بے دردی سے کہا تھا کہ میں آپ کے جنازے کو کاندھا دینے بھی نہیں آؤں گا۔''

وہ بھی رونے لگا۔

''دیکھیں..... اگر پچھتانے میں سارا وقت گزار دیا تو تلافی کیسے ہوگی.....؟ ٹھیک ہے.....! آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ اتنا ہی بہت کافی ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ تسمیہ سعودی عرب میں ہی کہیں ہوں گی۔''

''ایک ہی سورس تھی سر.....! ماموں عبدالعزیز والی..... مگر انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔''

وہ مسکرائے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر بولے۔

''جہاں پہ ہم نے انہیں کھویا ہے، وہیں پہ انہیں تلاش کرنا چاہئے۔''

''جی.....! کیا مطلب.....؟''

تینوں ایک ساتھ بولے۔

''ہمیں انہیں سعودی عرب میں ہی تلاش کرنا چاہئے۔ روپوش ہونے کا صحیح مقام بھی وہیں ہے اور برآمد ہونے کی صحیح جگہ بھی۔''

''مگر کیسے.....؟ کس طرح..... عطار صاحب.....؟''

تسمیہ بے چین ہوگئی۔

''میں بتاتا ہوں۔ پہلے درمان میاں سعودی عرب جائیں گے۔''

''میں سر.....! میں کیسے..... کس طرح.....؟''

''کل سوچ کر بتاؤں گا۔ مجھے ایک دن دیجئے۔ مجھے اُمید ہے انشاء

الله......! ہم انہیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"سر......! مگر کب تک......؟"

تابش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں ایک مہینے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ میری چھٹی ختم ہونے والی ہے۔"

"ٹھیک ہے......! میں کچھ کرتا ہوں۔ تھوڑا سا وقت دیجئے۔"

وہ اجازت لے کر چلے گئے۔

مگر ان تینوں کے دل پر ایک دیرپا نقش چھوڑ گئے۔

رات سوتے وقت تسمیہ نے سوچا۔

"کتنا شاندار مرد ہے۔ بالکل ہماری ماما کے جوڑ کا۔ افسوس میں ان سے ملے بغیر ان کی مخالفت کرتی رہی۔"

اسی قسم کی باتیں تابش سوچ رہا تھا۔

"یہ بندہ تو خود مسیحا لگتا ہے۔ اس کے چہرے پر لکھا ہے کہ یہ دُکھ بٹانے کے لئے آیا ہے۔

اور میں آپا کے کہنے پر خواہ مخواہ...... غلط باتیں اپنی ماما سے کہتا رہا۔"

اگلی صبح عطار صاحب کا فون آ گیا۔

انہوں نے درمان کے بارے میں پوچھا۔

"خیر تو ہے سر......!"

تسمیہ فکر مند ہوگئی۔

"خیر ہی کی تو خبر ہے بیٹی......!"

وہ ہنس کر بولے۔

"قدرت ہمارے ساتھ چل پڑی ہے۔"

"وہ کیسے......؟"

"سنو بیٹی......! جب قدرت کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیتی ہے تو پورے یونیورس کو ساتھ کر دیتی ہے اور راستے خود بخود بننے لگتے ہیں۔ میں گھر آیا تو میرے ایک عرب دوست کا پیغام آیا ہوا تھا۔ اس نے مدینہ منورہ میں ایک شاندار ہسپتال تعمیر کر لیا ہے اور پاکستان سے کچھ نوجوان ڈاکٹروں کی فوری ضرورت ہے۔ میں نے درمان کا نام تو فوراً دے دیا۔ اب اس سے کہو اپنے کاغذات اور پاسپورٹ لے کر میرے پاس پہنچ جائے۔"

❀ ❀ ❀

درمان کو مدینہ منورہ کے نئے ہسپتال میں تعینات ہوئے ایک ماہ ہوگیا تھا۔ یہ سب کام عطار صاحب کی وجہ سے جلدی جلدی تکمیل پا گئے تھے۔ یہ معلوم کر کے انہیں بے حد خوشی ہوئی کہ عرب دُنیا میں بھی عطار صاحب کا بہت احترام تھا۔

یہاں ملازمت کرنے کے بعد درمان نے پوچھا تھا۔

''میں ماما کو کیسے تلاش کروں گا سر......!''

تو انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

''پہلے اس ماحول سے مانوس ہو جانا۔ پھر کوشش کرنا کہ عشاء کی نماز ضرور مسجد نبویؐ میں ادا کرو۔ ہو سکے تو فجر کی نماز بھی...... یہ تمہاری ڈیوٹی کے اوقات پر منحصر ہے۔ بس اسی زمین پر مسجد کے اردگرد رہا کرنا۔ جب تک ممکن ہو...... سب کھوئی ہوئی چیزیں اسی زمین سے ملتی ہیں۔

سمجھ گئے......؟''

''جی......!''

''بہت تحمل سے...... انکساری سے...... جھک کر اس زمین پر چلا کرنا۔ جیسے تم اپنی کوئی کھوئی ہوئی شے تلاش کرتے پھرتے ہو۔ تلاش رائیگاں نہیں

جاتی۔''

''آپ کب آئیں گے سر......!'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''آجاؤں گا...... آ ہی جاؤں گا...... تم میرے ساتھ رابطہ رکھنا۔ ذرا ذرا سی بات مجھے بتاتے رہنا۔''

''جی اچھا سر......!''

فجر کی نماز میں تو وہ بس جمعہ کو ہی شامل ہوا کرتا تھا۔

مگر عشاء کی نماز میں ہر رات شمولیت کرتا تھا۔ کیونکہ ان وقتوں میں اس کی ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی۔ روز سجدے میں گر کے اللہ سے خشوع وخضوع کے ساتھ اپنی ماما کے بعافیت مل جانے کی دُعائیں کرتا۔ نماز کے بعد اس بڑے دروازے کی دہلیز میں آ کر بیٹھ جاتا جدھر سے عورتیں گزرا کرتی تھیں۔

ہر عمر کی عورت، ہر ملک کی عورت، ہر لباس میں ملبوس عورت۔ اور کالے کالے عبائے پہنے وہاں سے گزرا کرتیں۔

وہ تسبیح ہاتھ میں لے کے پڑھتا رہتا اور سب کے قدموں کو دیکھتا رہتا۔ اور یہ سوچا کرتا کہ کبھی میری ماما بھی یہاں سے گزری ہوں گی۔ وہ اپنی ماما کے پاؤں پہچانتا تھا۔

کیونکہ جب وہ تھک جاتی تھیں تو درمان ان کے پاؤں دباتا تھا۔ تب وہ اسے بہت دُعائیں دیتی تھیں۔ نرم نرم سبک سبک گورے گورے ماما کے پاؤں تھے۔ وہ ہمیشہ کہتا۔

''ماما......! آپ کے پاؤں بالکل بچوں جیسے ہیں۔ میں ان کو چوم لوں......!''

اور وہ پاؤں کھینچ لیتیں۔

وہ ہزاروں پاؤں میں سے اپنی ماما کے پاؤں پہچان لیتا تھا۔ پہچان سکتا تھا۔ اس لئے وہ چوکھٹ پر بیٹھا بس آتی جاتی عورتوں کے پاؤں دیکھتا رہتا۔ جب آخری عورت بھی گزر جاتی تو وہ اُٹھ کر گھر آجاتا۔

ایک روز وہ اسی طرح محویت سے قدم شماری کر رہا تھا تو اسے ایک دم ماما کے پاؤں جیسے پاؤں نظر آگئے۔ وہ اُٹھ کے دوڑا...... مگر سب برقعہ پوش خواتین تھیں۔ کسی کا چہرہ ننگا نہ تھا۔ ہجوم میں سارے پاؤں گم ہوگئے۔

پھر وہ پژمردہ چہرہ لئے گھر آگیا۔

ادھر پاکستان میں عطار صاحب نے تسمیہ اور تابش کو واپس اپنے اپنے ملک میں بھیج دیا تھا اور کہا تھا کہ جب کوئی اُمید افزا بات ہوگی، آپ کو بلا لیا جائے گا۔ مگر اگلی مرتبہ آپ اپنی پوری فیملی کے ساتھ آئیں۔

وہ دونوں تابعداری سے عطار صاحب کی باتوں کو ماننے اور تسلیم کرنے لگ گئے تھے۔ انہی کے ساتھ ان کی ساری اُمیدیں وابستہ ہوگئی تھیں۔ انہی میں ان کو اپنی نجات نظر آ رہی تھی۔

درمان مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے کے بعد اکثر بازاروں میں نکل جاتا۔ گلیوں میں گھومتا رہتا۔ جہاں کچھ عورتیں نظر آتیں، فاصلے پر کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگتا۔ اسے معلوم تھا اس ملک میں کسی جوان لڑکے کا عورتوں کے گرد منڈلانا یا انہیں گھورنا بہت بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔

مگر وہ کیا کرتا......؟ ہر برقعے میں اسے ماما نظر آتیں۔ اور ہر نقاب کے پیچھے ماں ہی کا گمان ہوتا۔

وہ تھک جاتا...... وہ رو پڑتا...... مگر مایوس بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ابھی اسے یہاں آئے صرف دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس کی ملازمت پکی ہوگئی تھی۔ عطار صاحب سے اس کا رابطہ رہتا تھا۔ بہن اور بھائی سے بھی بات کرتا رہتا تھا۔ مگر ماموں عبدالعزیز کو اس نے اپنے یہاں منتقل ہونے کی خبر نہیں دی تھی۔

حرم شریف میں نماز پڑھتے ہوئے اس پر عجیب کیفیات گزرتیں۔
خصوصاً جب تمام نمازی التحیات پڑھتے ہوئے
''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''
پڑھتے وقت بے اختیار انگشت شہادت اُٹھاتے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

یہ بات ماما نے اسے سمجھائی تھی کہ

''دیکھو عالم اسلام کا سارا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ انگشت شہادت سے جڑا ہوا ہے۔ کون کیا ہے، بادشاہ ہے یا غلام...... عربی ہے کہ عجمی...... ہندی ہے کہ صحرائی...... سب ایک قطار مین ایک ساتھ انگشت شہادت بلند کرتے ہیں کہ سب دل سے ایک ہی بات کی گواہی دے رہے ہوتے ہیں۔

اور قیامت تک ایسا ہوتا رہے گا۔ اللہ کے گھر میں اللہ کے بندے ایک جیسی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک جیسے آداب سیکھ لیتے ہیں۔ ایک جیسے نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی بندگی ہے اور اس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔

اس لئے مایوس کبھی نہ ہونا۔ اسلام بڑا سچا اور دل میں اُتر جانے والا مذہب ہے۔''

درمان جب بھی مسجد میں نماز پڑھنے آتا، اسے ماما کی باتیں بہت یاد آتیں۔

افسوس وہ ماما کے ساتھ عمرہ کرنے کبھی نہ آسکا۔ مگر اب قدرت نے اسے یہاں بھیج دیا۔

''مگر ماما......! ماما کہاں ہے......؟''

اس رات وہ عشاء کی نماز پڑھتے ہوئے بہت رویا۔ سجدے میں گر کر روتا رہا۔ اللہ سے دُعائیں کرتا رہا۔

''اس مسجد کے صدقے میں...... ان صفوں کے صدقے میں رب کریم......! میری ماما کا اتا پتا بتا دے۔ ان نمازیوں کی خیر خیرات دے ...... اپنے حبیب پاکؐ کے وسیلے سے میری فریاد سن......!''

سب نمازی باہر نکل گئے تھے۔ مسجدِ نبویؐ تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ جب ایک نمازی نے اسے سجدے میں روتا دیکھ کر اُٹھایا۔ پھر عربی زبان میں کہا۔

''مسجد بند ہونے والی ہے۔''

وہ کھڑا ہوگیا۔ اپنے آنسو صاف کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

نمازیوں کا ہجوم بکھر چکا تھا۔ عورتوں والا دروازہ بھی خالی خالی نظر آ رہا تھا۔

اِکا دُکا نمازی عورتیں یا مرد اندر سے نکلنے آ رہے تھے۔

وہ باہر والے ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔

دھیان اِدھر اُدھر ہی تھا۔ قریب سے دو برقعہ پوش عورتیں گزریں۔ ایک کی تسبیح گر گئی۔ جھک کر اٹھائی تو ذرا سا چہرہ نظر آیا۔ درمان چونک گیا۔

ذرا سی جھلک......مگر وہ ماما کی طرح تھی۔

پیچھے چل پڑا...... پاؤں دیکھے...... ایک عورت کے پاؤں بالکل ماما کی طرح تھے۔ ماما کی ایک چھنگلی بہت لمبی تھی اور ایک بالکل نکتے کے برابر...... تو وہ ماما کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ تب ماما نے اسے بتایا کہ بچپن میں انہیں سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا۔ بڑوں والی سائیکل اُٹھا کر سیکھنے لگ جاتی تھیں۔

ایک بار اس کی چین (Chain) میں پاؤں پھنس گیا اور چھنگلی کٹ گئی تھی۔

وہ پیچھے چلتا رہا۔ جب وہ دونوں ایک گلی کے قریب پہنچی تو اس نے آہستہ سے کہا۔

''ماما......!''

ایک عورت رُک گئی۔ دوسری بھی اس کے ساتھ رُک گئی۔

پہلی عورت نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

درمان ڈر گیا۔

مگر اس کا دل دھڑک اُٹھا۔

دونوں عورتیں دوڑ کر گلی میں روپوش ہوگئیں۔

کہاں......؟ کس طرف......؟ وہ دیکھتا رہ گیا۔

مگر جیسے اس کے دل کو یقین آگیا کہ اس کی ماما یہیں کہیں ہے۔

اس کے بعد وہ عشاء کی نماز پڑھ کے اس گلی کے آس پاس رہنے لگا۔ کبھی کبھی ایسے فضا میں منہ بلند کر کے ''ماما'' کہہ دیتا۔

مگر پھر کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ نہ ویسے پاؤں ہی نظر آئے۔ لیکن اس کا جنوں دوچند ہوگیا۔

❁ ❁ ❁

تین دن سے تسبیحہ اپنے حجرے میں پڑی بخار سے پھنک رہی تھی۔ مگر ڈاکٹر کو دکھانے سے انکار کر رہی تھی۔ یہاں بنگلہ دیش کی ایک خاتون غلام زہرہ اس کی روم میٹ تھی۔ دونوں کی ڈیوٹی بھی اکٹھی لگتی تھی اور دونوں اکٹھی آتی جاتی تھیں۔ اس نے یہاں اپنا اصلی نام کسی کو نہیں بتایا تھا۔ ساری خادماؤں سے کہہ رکھا تھا کہ اسے صابرہ بلایا کریں۔

یہاں ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ کسی کو کسی کی اصلیت جاننے کی دھن ہی نہ تھی۔ یہ مقام ایسا تھا۔ یہاں پر آجانا ہی بڑی بات تھی۔

ہر صبح جاتے ہوئے غلام زہرہ اسے ناشتہ بنا کے دے جاتی اور دوائی بھی۔ اور تاکید کر کے جاتی کہ آج ہسپتال جا کر ڈاکٹر کو ضرور دکھا دینا۔ مگر اسے دوائی کھانے یا ڈاکٹر کو دکھانے سے ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک عجیب آگ میں جل رہی تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ نفس کی ہر کھائی اس نے پار کر لی ہے۔ دنیا تج دی ہے اور ایک راستہ اختیار کر لیا ہے۔

تقریباً ایک سال ہوگیا تھا۔ اسے مسجد نبویؐ میں صفائی کرتے ہوئے۔ اس نے باقاعدہ کالا عربی برقعہ پہن لیا تھا۔ وہ دورانِ صفائی نقاب نہیں اٹھاتی تھی۔ مبادا کوئی واقف کار مل جائے۔ اس کی زندگی مطمئن تھی۔ رگڑ

رگڑ کر وہ مسجد نبویؐ کا فرش صاف کرتی۔ بعض اوقات اپنے آنسو بھی اس پانی میں شامل کر لیتی۔ دیواروں کو جھاڑتی۔ قالین پر مشین چلاتی۔ زم زم کے اردگرد گرا ہوا پانی صاف کرتی۔ پانچوں وقت اندر نماز ادا کرتی۔ سجدۂ شکر ادا کرتی کہ اللہ تعالیٰ نے حرم شریف کی صفائی اس کے ذمے لگا کر اس کی عاقبت سنوار دی تھی۔

فالتو وقت میں وہ تسبیح لے کر اللہ کے ناموں کا وِرد کرتی رہتی یا درود پاک پڑھتی رہتی۔

یہ تو اللہ اور اس کے حبیبؐ کی دنیا تھی۔

یہاں تو دن رات جلوؤں کی برسات ہوتی تھی۔

یہاں تو ہر محفل مجتمع ہونے کے لئے بکھرا کرتی تھی۔

یہاں دنیا بھر کی مخلوق ہر وقت ہر آن جمع رہتی تھی۔ یہاں سب کا ایک ہی لباس تھا۔ ایک ہی زبان تھی اور ایک ہی صف تھی۔

ہر روز صفیں بھر جاتیں۔ ہر روز بھری ہوئی صفوں میں برکت آجاتی۔

یہاں تو اللہ کے بندوں کو مسلسل دیکھتے رہنا بھی عبادت کا درجہ تھا۔

وہ چاہتی کہ وہ تنکا تنکا ہو کر بکھر جائے۔ ان صفوں پر بچھ جائے۔ اس خاک میں شامل ہو جائے۔

عجیب کیفیت رہتی اس کی۔

رمضان المبارک میں اس نورانی بستی کا رنگ ہی اور تھا۔

وہ سحری کے وقت آجاتی۔ پتہ نہیں کہاں سے سحری آجاتی۔ وہ سب کھا لیتیں۔ روزے رکھ لیتیں۔ وہ تہجد کی نماز بھی یہیں ادا کرتی۔ تراویحیاں

بھی یہیں پڑھتی۔

رجب، شعبان، رمضان کے علاوہ بھی اس زمین پر عشاق کا ہجوم رہتا۔

یہ زمین نہیں تھی۔ یہ آسمان کا ایک ٹکڑا تھا۔

صبح شام اس کی ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اس کی اندر سبز جالیوں کے پاس بھی ڈیوٹی لگتی تھی۔ کیونکہ ہفتے میں دو دن فجر کی نما کے بعد موجہ شریف کا دروازہ عورتوں کے لئے کھول دیا جاتا تھا۔

جب ساری دنیا سے آئی مسلمان عورتیں چیخ چیخ کر اور چلا چلا کر اندر آتیں اور آنسوؤں کے آبشار کھل جاتے۔

دُعائیں...... آہیں...... کراہیں...... ساری فضاء میں بکھر جاتیں تو تھر تھر کانپنے لگتی۔

نقاب کے اندر جھر جھر رونے لگتی۔

''تیرے یہ نصیب...... تسمیحہ......! تیرے یہ نصیب......!''

دن میں نہ جانے کتنی بار وہ مسجد میں سجدۂ شکر ادا کرتی۔

''اور مقام جنت کیا ہوگا......؟

مجھے تو میری جنت دنیا میں ہی مل گئی۔''

وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔

اپنے دُکھ، اپنا ماضی، اپنی اولاد

سب کچھ بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

اب یہی اس کی منزل تھی۔ اور یہی مقصود بھی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا......؟

اس رات اچانک...... غیر متوقع طور پر اس نے درمان کو دیکھ لیا۔

''ماما......!''

اس نے اس طرح پکارا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مُڑ کر دیکھ لیا۔

اُداس، ویران، پریشان، تھکا ہوا درمان کھڑا تھا۔ آنسوؤں میں فریاد تھی۔

اس کی ماممتا چیخ اُٹھی۔

وہ تو سمجھتی تھی کہ وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

ہر رشتہ قربان کر دیا ہے۔

''مگر یہ کیا......؟''

وہ وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ ساری رات اپنے دل سے لڑتی رہی تھی۔ ذہن سے جھگڑتی رہی تھی۔ پھر اسے تیز بخار ہو گیا۔

رات بھر وہ ہذیان بکتی۔

''جاؤ......! میں تمہاری ماں نہیں ہوں...... میں کسی کی ماں نہیں ہوں......تمہاری کوئی ماں نہیں ہے...... ہواؤں کے پیچھے نہ دوڑو...... جاؤ لوٹ جاؤ......!''

''صابرہ......!''

صبح اُٹھ کے غلام زہرہ نے کہا۔

''تم بے ہوشی میں کس سے باتیں کرتی رہتی ہو......؟ کس سے کہتی رہتی ہو کہ میں تمہاری ماں نہیں......؟''

تو وہ رونے لگی۔

''پتہ نہیں......! بخار کی بے ہوشی میں کیا کیا بک دیتی ہوں۔''

''جانے کیا بات ہے صابرہ......! میں اس لڑکے کو دیکھتی ہوں تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔''

''کون سا لڑکا......؟''

تسبیح نے پوچھا۔

''وہی جو اس دن ہر عورت کے پیچھے دوڑ دوڑ کر ماما کہہ رہا تھا...... ماما...... ماما...... کہہ کر باؤلوں کی طرح پکار رہا تھا۔''

تسبیح نے اپنا کلیجہ مٹھی میں دبا لیا۔

''پتہ ہے پرسوں سے وہ ہماری گلی کی نکڑ پر ہی کھڑا ہوتا ہے۔ پتہ نہیں بچارے کی ماں ہجوم میں گم ہو گئی ہو گی یا اس کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔''

''تم نے کیسے سمجھ لیا......؟ وہیں اندر مسجد میں ہو گی...... انتظار کر رہا ہو گا۔''

تسبیح نے اپنے آنسوؤں کو روک کر کہا۔

''نہیں صابرہ......! تم نے اس کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔

بہت غمزدہ لگتا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے...... رُک کر اسے پیار کروں۔ تسلی دوں۔''

غلام زہرہ نے کہا۔

''ایسا نہ کرنا...... کہیں......''

تسمیہ جلدی سے بولی۔

''لو بھلا..... میں کیوں ایسا کرنے لگی.....؟ ہاں.....! حرم شریف میں نماز پڑھ کے روز دُعا کرتی ہوں کہ اس کی ماں اس کو مل جائے۔ بڑا پیارا بچہ ہے۔''

''کل صبح سے میری ڈیوٹی موجہ شریف کے دروازوں پر شروع ہو رہی ہے۔کل تہجد کے وقت جاؤں گی۔''

تسمیہ نے کہا۔

''صابرہ.....! تمہاری طبیعت بہت خراب ہے۔ دیکھو کتنا تیز بخار ہے۔ میرا کہا مانو..... کل ہسپتال چلی جاؤ۔ ایسا نہ ہو تمہاری طبیعت مزید خراب ہو جائے۔ میں تمہاری بیماری کی اطلاع دفتر کو دے دوں گی۔''

''زہرہ.....! مجھے مشورے نہ دو۔ لِللہ.....! مجھے مشورے نہ دو.....!''

تسمیہ رونے لگی۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں بہت سخت جان ہوں۔ تین مہینے کے بعد اندر میری باری آتی ہے۔ میں اپنی باری پر ضرور جاؤں گی۔''

غلام زہرہ اس کو سمجھاتی سمجھاتی خود سو گئی۔

ابھی تہجد کی اذان ابھری تھی کہ تسمیہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ وضو کیا۔ برقعہ پہنا اور حرم شریف کی طرف بھاگی۔

پچھلی راتوں کا چاند گنبد خضریٰ پر نثار ہونے کے لئے عین اس کے اوپر آ گیا تھا۔ زمین اتنی روشن تھی کہ ستارے ستارے جھک جھک کر رشک

سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی دیوانوں کی طرح سائے سے بنے ادھر اُدھر نکل کر آ رہے تھے۔

پتہ نہیں تسمیہ کے قدموں میں اتنی تیزی کہاں سے آ گئی تھی.....؟

غلام زہرہ اُٹھ کر اسے پکارتی رہ گئی۔ مگر وہ حرم شریف پہنچ گئی۔

تہجد پڑھی۔ تلاوت کی۔ فجر کی نماز میں باجماعت پڑھی۔ پھر دوڑتی ہوئی اندر والے دروازوں کی طرف بڑھی۔ وہ آج اپنی ڈیوٹی سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ آج وہ فریاد سے بھری ہوئی تھی۔

اور اس کا دل اس کے بس میں نہیں تھا۔

صبح آہستہ آہستہ سفید ہوتی جا رہی تھی۔ نماز پڑھ کے عورتوں کا رخ اس دروازے کی طرف ہو رہا تھا۔

وہاں اور بھی خادمائیں موجود تھیں۔ وہ اپنی ڈیوٹی والی جگہ پر پہنچ چکی تھی۔ مگر دروازے کھلنے سے پہلے اپنی عرضی بھی پیش کرنا چاہتی تھی۔

اس لئے وہ نوافل پڑھ کے سبز جالیوں کے سامنے سجدہ ریز ہوگئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''یا نبیؐ

یا نبیؐ

حضور! میری مدد فرمائیں۔

حضور! چارہ گری فرمائیں۔

میں آپ کے در پر آ گئی ہوں۔

حضور! مجھے سہارا دیں۔

میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیں۔

آپ کے در سے کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔

میرے دل کو صبر اور سکون دیجئے۔

میں آل اولاد کی محبت تج کے یہاں آئی تھی۔

پھر میرا دل پیچھے کی طرف دوڑ رہا ہے۔

میری مدد کیجئے۔

اے شہنشاہوں کے شہنشاہ!

اے بے کسوں کے والی!

اے بیماروں، ضعیفوں، مجبوروں کے آقا!

در پر پڑی ہوں۔

مجھے نہ ٹھکرایئے گا۔

مجھے نہ واپس بھیجئے گا۔

میرے دل سے ماسوا کی اُلفت نکال دیجئے۔

مجھے سہارا دیجئے۔

یارسول اللہؐ...... انظر حالنا...... انظر حالنا

اغثنی...... اغثنی...... یارسول اللہ!

اغثنی...... اغثنی...... (میری مدد فرمائیں)۔

وہ رو رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ اور مصلے اپنے آنسوؤں سے بھگو رہی تھی کہ ایک دم باہر والے دروازے کھل گئے۔ پیشتر اس کے کہ وہ کھڑی ہوتی۔ عورتوں کا ہجوم دیوانہ وار اندر آ گیا۔ اس کو کچلتا ہوا آگے نکل گیا۔

ہجوم میں جو بیمار اور کمزور عورتیں تھیں، وہ بھی گر گئیں...... کسی کو چوٹ آئی...... کوئی بے ہوشی ہوگئی۔

ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا۔ یہاں کوئی اپنے آپ میں کب رہتا تھا......؟

بعد میں خادماؤں نے باقی سب عورتوں کے ساتھ اسے بھی اُٹھایا اور ہسپتال میں پہنچا دیا۔

❀ ❀ ❀

صبح صبح ایمرجنسی فون کی گھنٹی بجی۔

آج درمان چھٹی پر تھا۔ مگر ایمرجنسی فون تو کسی وقت بھی آ سکتا تھا اور وہ ڈاکٹر تھا۔ اسے کسی وقت بھی بلایا جا سکتا تھا۔ اس کے پیشے کا بھی یہی تقاضا تھا۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور فون اُٹھا لیا۔

ادھر ایم ایس کہہ رہے تھے۔

''کچھ عورتیں زخمی حالت میں آئی ہیں۔ فوراً پہنچو......!''

تو وہ ہسپتال پہنچ گیا۔

جن کو معمولی زخم آئے تھے۔ مرہم پٹی کر کے ان کو گھر بھیج دیا گیا۔

جن کے بازو یا ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی تھی۔ انہیں مکمل علاج تک داخل کر لیا گیا۔

''ایک مریضہ کی حالت بہت نازک ہے۔'' نرس دوڑتی ہوئی آئی۔

''جی......! وہ بعد میں لائی گئی ہے۔ اس کا پورا کندھا اُتر گیا ہے اور وہ بے ہوش ہے۔''

''تم ان مریضوں کو سنبھالو۔ میں اسے دیکھنے جاتا ہوں۔''

اس کے باس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

شام تک درمان بڑی جانفشانی سے ان عورتوں کی مرہم پٹی کرتا رہا تھا۔

اس لئے اس کے باس نے اسے یہ کہہ کر اگلے دن کی چھٹی دے دی کہ ہم نے آپ کی چھٹی خراب کر دی تھی۔ تیسرے دن درمان پورے وارڈ کا چکر لگا رہا تھا۔ زیادہ تر مریض خواتین کو ان کے لواحقین آ کر لے گئے تھے۔ بس ایک مریضہ جنرل وارڈ میں رہ گئی تھی۔ جسے کوئی دیکھنے نہیں آیا تھا۔

''سر......! وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئیں۔ بس کبھی کبھی ہذیانی انداز میں رونے لگتی ہیں اور باتیں کرنے لگتی ہیں۔''

''کس ملک کی ہیں......؟'' درمان نے پوچھا۔

''ہیں تو پاکستانی مگر ایک سال سے پاکستانی خادماؤں میں شامل ہیں۔ جو حرم شریف کی صفائی کے لئے مامور کی جاتی ہیں۔''

''چلو دیکھتے ہیں......!''

درمان نرس کے ساتھ چلتا ہوا بے ہوش مریضہ کے قریب آ کر ٹھٹک گیا...... پتھر ہو گیا...... اوپر کی سانس اوپر...... اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

''ماما......!''

کہتے کہتے اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔

کتنی دیر تک وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ جن قدموں پر ماتھا ٹیکنے کی حسرت تھی، وہ سامنے تھے۔ وہ پاؤں جنہیں وہ پہچانتا تھا...... جنہیں راستوں میں تلاش کرتا پھرتا تھا، جنہیں بڑھ کر چومنا چاہتا تھا۔

منزل چل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس حالت میں...... ایک پورے

کندھے پر پلستر چڑھا تھا۔ دوسرے بازو پر نالیاں لگی تھیں۔ چہرے کے زخموں پر پٹیاں لگی تھیں۔ پٹیاں ایک ٹانگ پر بھی تھیں۔

مگر ہزار ہا پٹیوں میں بھی وہ اپنی ماما کو پہچان سکتا تھا۔

جب وہ ان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا...... ان کے جسم میں حرکت ہوئی اور وہ بڑبڑانے لگیں۔

”میں تمہاری ماں نہیں ہوں...... نہیں ہوں دانی...... تم میرے پیچھے کیوں آئے ہو......؟ جاؤ......! چلے جاؤ......! میری منزل کھوٹی نہ کرو...... میں اس در کی ہو چکی ہوں۔“

یہ سنتے ہی دانی رونے لگا۔

”شکر ہے یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے دلار کا نام ورمان ہے۔ یہاں سب اسے ڈاکٹر توکل حسین ربانی کے نام سے جانتے تھے اور ماما کی شیٹ پر بھی صابرہ بی بی لکھا ہوا تھا۔

نرس نے ایک دم ڈاکٹر کو دیکھ کر پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب......! آپ رو رہے ہیں......؟“

”نہیں......! ہاں......!“

ورمان نے آنکھیں صاف کیں اور حاضر دماغی سے بولا۔

”اس محترم خاتون کی شکل میری امی سے بہت ملتی ہے۔ دیکھتے ہی ماں یاد آ گئی۔“

بیشتر اس کے کہ نرس کوئی اور سوال کر دے، اس نے ان کی چارج شیٹ دیکھی۔ اور پھر نرس سے بولا۔

”آج ہی پرائیویٹ وارڈ میں کمرہ نمبر 3 خالی ہوا ہے۔ انہیں وہاں منتقل کر دو۔ ان کا سارا علاج میں اپنے خرچے پر کروں گا اور دن رات ڈیوٹی بھی دوں گا۔ ذرا جلدی کرو۔“

حیران سی نرس کو اس نے مڑ کر دیکھا اور بولا۔

”آپ کو وہ حدیث مبارکہ یاد ہے جس میں حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

”اگر ماں کی صورت کی کوئی عورت مل جائے تو
اس کی خدمت کا اجر وہی ہوتا ہے جو ماں کی خدمت
کرنے کا ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

پھر جب وہ ہسپتال کی ڈیوٹی سے فارغ ہوتا تو کمرہ نمبر 3 میں آ جاتا۔ ساری رات وہاں بیٹھا رہتا۔ رات کی نرس کو واپس بھیج دیتا۔

ان حالات کی اطلاع اس نے یہیں بیٹھے بیٹھے عطار صاحب کو کر دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ آپ نے ٹھیک فرمایا تھا۔ انہی جگہوں سے مجھے اپنی ماں کا سراغ مل گیا ہے۔

تو انہوں نے جواب میں کہا تھا۔

”مزید ہدایات کا انتظار کرو۔“

ایک دن جب تسبیحہ اچھی طرح ہوش میں تھی تو اس نے کمرے کے چاروں دیکھا۔

میز پر تازہ پھول پڑے تھے۔ موسمی پھلوں کی ٹوکری پڑی تھی۔ سامنے کلر ٹی وی تھا۔ کمرے میں ہر سہولت تھی۔ ملحقہ غسل خانہ تھا۔

حیران ہوتی رہی۔ یہ تو وی آئی پی کمرہ تھا اور وہ تو خادمہ تھی۔ خادمائیں ایسے کمروں میں نہیں رہتیں۔

نرس آئی تو اس نے پوچھ لیا۔ وہ بولی۔

”ایک پاکستانی ڈاکٹر ہیں۔ ان کی ہدایات پر آپ کو یہاں رکھا گیا ہے۔“

رات کو جب نرس تسبیحہ کو ساری دوائیاں دے دیتی۔ ساتھ نیند کی گولی بھی دے دیتی اور وہ گہری نیند سو جاتیں۔ تو درمان ان کے کمرے میں آجاتا اور رات بھر کی ڈیوٹی دے کر علی الصبح دوسری ڈیوٹیاں ادا کرنے چلا جاتا۔

رفتہ رفتہ تسبیحہ کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ توانائی آنے لگی۔ اس کا دایاں کندھا اُتر گیا تھا۔ اس پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ ہمہ وقت جو شدید درد ہوتی رہتی تھی، اس میں بھی کمی آنے لگی۔ تو وہ اردگرد کی چیزوں پر غور کرنے لگی اور ہر وقت نرس سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگی۔

اس رات جب وہ گہری نیند میں اُتر گئی تو درمان حسب معمول سٹول اُٹھا کے اس کی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ پہلے اس کے پاؤں سہلاتا رہا۔ پھر پاؤں پر ماتھا رکھ کے اونگھ گیا۔

لیکن وہ تو سونے کا ڈرامہ رچا رہی تھی۔ اسی وقت اس نے اپنا پاؤں کھینچا تو درمان نے چونک کر سر اُٹھایا۔ انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے درمان کو یوں قدموں میں بیٹھا دیکھا تو جذباتی ہوئیں۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے بازوؤں میں لینا چاہا تو بازو ہلے بھی نہیں۔ پھر وہ دھاروں رونے لگیں۔

''دانی......! دانی......!''

روتی جاتیں اور کہتی جاتیں۔

وہ اٹھ کے ان کے قریب آگیا۔ بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ان کے رخسار پر رخسار رکھ کر خود بھی رونے لگا۔ ماں بیٹا کے آنسوؤں کی دھارا ایک ساتھ بہتی رہی اور فاصلوں کو سمیٹتی رہی۔

بالآخر درمان نے سر اُٹھایا۔ ٹشو پیپر پکڑ کے پہلے اپنے آنسو صاف کئے پھر ماں کا چہرہ صاف کرنے لگا۔

''ماما......! تم نے ہمیں ایسی سزا کیوں دی......؟''

وہ بولا۔

''درمان......! تم نے مجھے کیوں ڈھونڈا......؟ سمجھ لیتے کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔''

''ماما......! بچے کا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کی ماں زندہ ہے۔ ماں......! ہر وقت تو میرے دل میں دھڑکتی رہتی تھی۔ اگر میرا دل بند ہو جاتا تو پھر بھی ایسا سوچتا۔''

''ایسا نہ کہو دانی......! اللہ کے واسطے...... ایسا نہ کہو......!''

''ماما......! اب تم ہمیں معاف کر دو۔''

''نہیں بیٹا......! میں تم لوگوں سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ تمہاری وجہ سے مجھے منزل کا سراغ ملا۔ میں دنیا کے سب سے خوب صورت کام کے لئے چن لی گئی۔ تمہیں کیا پتہ کہ میں یہاں کتنی خوش ہوں۔ کتنی آسودہ ہوں۔

بس...... اس دن جب تم مجھے نظر آئے...... میری زندگی بے سکون

ہوگئی۔ تم کیوں یہاں آگئے بیٹا......؟ ایک دن تو مجھے تم سب لوگوں کو چھوڑ کر جانا ہی تھا۔''

''ماما......! مدینہ منورہ میں رہ کر اور بھی بہت کام ہو سکتے تھے...... تم نے یہ کام کیوں پسند کیا......؟''

''بس......!''

وہ اب تڑپ کر بولیں۔

''آگے ایک لفظ نہ کہنا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اس کام کے لئے چن لی گئی۔ میں دُنیا میں اسی کام کے لئے بھیجی گئی تھی۔

میں ہمیشہ حرم شریف میں جھاڑو لگاتی رہوں گی۔ نمازیوں کے جوتے سیدھے کرتی رہوں گی جو مجھے اس کام سے منع کرے گا۔ وہ میرا کچھ نہیں لگتا ہوگا۔''

''اچھا ماما......! اچھا...... اب رونا بند کرو۔ میں تمہیں تھوڑا جوس پلا دوں۔''

اس نے ماں کو بٹھایا اور جوس پلانے لگا۔

جب تسمیہ کی طبیعت ذرا قرار میں آئی تو اس نے پوچھا۔

''دانی......! تو یہاں آیا کیسے......؟ کب آیا......؟ مجھ بتا......!''

اس نے کہا۔

''ماما......! پہلے تو یہ دوائی کھا لو۔ آرام سے لیٹ جاؤ اور وعدہ کرو کہ غصہ نہیں کرو گی۔ پھر میں تمہیں ساری کہانی تفصیل سے بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے......!''

تسمیہ دوائی کھا کے لیٹ گئی۔

درمان سٹول کھینچ کر قریب لے آیا۔ اور اس نے تینوں بہن بھائیوں کی عطار صاحب سے ملاقات کے بارے میں بتلایا اور یہ بھی کہ عطار صاحب نے یہ ملازمت میرے لئے ڈھونڈ دی۔ اور مجھے یہ کہہ کر یہاں بھیج دیا کہ اس سرزمین پر روح کا قرار ملتا ہے۔ یہاں کھوئی ہوئی چیزیں خود آ کر مل جاتی ہیں۔ یہاں حضورؐ پُرنور خود اپنے اُمتیوں کی فریاد سنتے ہیں۔ ان کی نگری سے نہ کبھی کوئی مایوس لوٹا ہے اور نہ خالی ہاتھ آیا ہے۔ یہاں آنے والا آپؐ ہی کا مہمان ہوتا ہے۔ تم جاؤ، وہاں لوگوں کی خدمت کرو۔ فریادی بن کر اس چوکھٹ پر بیٹھ جاؤ۔ وہیں سے تمہیں اپنی ماں کا سراغ ملے گا۔ وہاں کوئی گم نہیں ہوتا۔ وہ یافت اور دریافت کی زمین ہے۔

''اس عقیدے کو لے کر ماما......! میں یہاں چلا آیا تھا۔''

جب تک درمان سارا قصہ بتاتا رہا، تسمیہ روتی رہی۔ وہ بھی تو فریادی بن کر اس دروازے پر آ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ چپ ہوئی تو بولی۔

''درمان......! اب تم میرے بارے میں عطار صاحب کو کچھ مت بتانا۔ تسمیہ اور تابش کو بھی مت بتانا کہ میں یہاں ہوں۔''

''سوری ماما......! میں نے تو جس دن آپ کو ہاسپٹل میں دیکھا تھا، ان سب کو بتا دیا تھا اور اب بھی ہر رات پل پل کی رپورٹ دے رہا ہوں۔''

''دانی......! یہ تم نے کیا کیا......؟''

''کیوں ماما......؟ تم اپنے بچوں کی پریشانی سے خوش ہوتی ہو......؟''

''نہیں دانی......! میں ان کے مسائل میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔''

''بس ماما......! ایک سال سزا دینے اور تڑپانے کے لئے بہت ہوتا ہے۔ آپ کو کیا پتہ آپا اور بھیا کا کتنا برا حال ہے۔ اپنے روّیے پر وہ کتنے دُکھی ہیں۔''

''ہاں دانی......! تم ماموں شیخ عبدالعزیز سے ملے ہو......؟''

''نہیں ماما......! جب انہوں نے آپ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے سوچ لیا تھا کہ ان سے ملنا لاحاصل ہوگا۔ وہ آپ کی صحیح خبر کبھی نہ دیں گے۔''

''ہاں بیٹا......! میں نے انہیں قسم جو دی تھی۔ اب تم فوراً انہیں میری بیماری کی اطلاع دو اور کہو کہ آ کر مجھ سے مل جائیں۔''

❁ ❁ ❁

شیخ عبدالعزیز کو سفارت خانے سے بھی تسبیحہ کی علالت کی خبر مل گئی تھی اور یہ بھی کہ اس کا پہلا کنٹریکٹ جو ایک سال کا تھا، ختم ہو چکا ہے۔
دستور کے مطابق اگر وہ اگلا سال بھی اسی ملازمت پر رہنا چاہتی ہے تو نئے سرے سے عرضی دے کر اپلائے کرنا پڑے گا۔
جب درمان نے انہیں فون پر ماما کا پیغام دیا تو وہ بولے۔
"میں پہلے ہی اپنی بیگم کے ساتھ نکل چکا ہوں۔ اب راستے میں ہوں۔"

ایک ہفتے بعد جب تسبیحہ کا پلستر کھل گیا اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی تو شیخ عبدالعزیز انہیں جدہ میں اپنے گھر لے آئے اور درمان سے کہنے لگے۔

"یہاں اس کے بھائی کا گھر ہے۔ وہاں یہ کچھ دن آرام کریں گی۔ پھر فیصلہ کریں گی کہ آگے کیا کرنا ہے......؟"
ویسے تو درمان بھی ماما کے ساتھ ہی جدہ میں آگیا تھا۔ لیکن پھر وہ اپنے ہسپتال کی ڈیوٹی پر مدینہ منورہ واپس آگیا۔ ویک اینڈ پر وہ یہاں آجاتا تھا۔

جتنی تبدیلیاں یہاں پر رونما ہوئیں، ان کے بارے میں وہ عطار صاحب اور تسبیحہ اور تابش کو اطلاع دیتا رہا تھا۔
اور عطار صاحب بھی اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

اگلے ویک اینڈ پر تسبیحہ درمان کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ مدینہ منورہ سے یہاں آجایا کرتا تھا۔ اسے کافی دیر ہوگئی تو تسبیحہ نے شیخ عبدالعزیز سے فون پر پوچھا کہ درمان ابھی تک کیوں نہیں آیا......؟
انہوں نے جواب دیا کہ درمان کچھ مہمانوں کو لانے کے لئے ایئر پورٹ گیا ہے۔
"وہ کس کے مہمان ہیں یا اخی......؟"
تسبیحہ نے پوچھا۔
"مجھے بتا کر نہیں گیا۔ بس اس نے جدہ پہنچ کر مجھے فون پر اتنا ہی بتا دیا تھا کہ اگر ماما میرا پوچھیں تو انہیں کہہ دینا۔ میں کچھ مہمانوں کو ریسیو کرنے آیا ہوں۔ اگر فلائٹ وقت پر آگئی تو وہ جلدی پہنچ جائے گا۔"
"ہاں......! میں بھی اسے فون کر رہی تھی مگر اس کا سگنل نہیں بول رہا تھا۔"

"شاید کسی ایسی جگہ پر ہوگا جہاں سگنل کام نہیں کر رہا ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ فارغ ہوتے ہی آپ کو فون کرے گا۔ ماشاء اللہ......! آپ کا بیٹا بڑا ذمہ دار ہے اور بہترین ڈاکٹر ہے۔ ہسپتال میں بھی سب اس کی تعریف کرتے تھے۔"

"اللہ کا شکر ہے اخی......! اللہ نے نیک اولاد دی ہے۔ اولاد نیک اور فرمانبردار ہو تو ماں کا بڑھاپا سنور جاتا ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔"

ابھی وہ لوگ فون پر بات کر رہے تھے کہ درمان کمرے میں داخل ہوا۔

"یا اختی......! درمان آگیا ہے۔ بہت شکریہ آپ کا۔ اب میں اس سے بات کر لیتی ہوں۔"

فون بند کر کے اس نے درمان سے پوچھا۔

"بیٹا......! کون مہمان تھے......؟ کن کو لینے گئے تھے......؟ مجھے بتایا ہی نہیں......!"

"ماما......! مہمان آپ سے بھی ملنے آئیں گے۔ مگر پہلے کھانا تو کھا لیں۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

❁ ❁ ❁

درمان نے تو کہہ دیا تھا کہ وہ آپ کی مزاج پرسی کو آئیں گے۔ مگر ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی تھی۔

شیخ عبدالعزیز کے عزیز و اقارب بھی اس کی عیادت کو آئے تھے۔ اب اس نے عربی زبان پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا۔ ملاقاتیوں سے ٹھیک ٹھاک گفتگو کر لیتی تھی۔

پہلے درمان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد شیخ عبدالعزیز آئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

"اختی......! آپ کے مہمان آگئے ہیں۔"

وہ بڑی متجسس نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اچانک سامنے عطار صاحب نمودار ہوئے۔

ہمیشہ کی طرح چمکتے چہرے کے ساتھ اور مہکتی مسکراہٹ کے ساتھ۔ انہوں نے پاکستانی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ یعنی شلوار قمیض کے اوپر سفید شیروانی پہنی ہوئی تھی۔

اتنے دلکش اور دلربا لگ رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا بھول گئی۔ وہ قریب

آئے۔ انہوں نے سلام کیا اور پھر بولے۔

"بیٹھ جاؤں......!"

"جی جی......!"

وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"ضرور تشریف رکھیے......!"

وہ بیٹھ گئے۔

پھر درمان کی طرف منہ کر کے بولی۔

"اتنا سسپنس پیدا کر رکھا تھا آپ نے...... صرف مجھے سرپرائز دینے کے لیے......؟"

عطار صاحب ہنسنے لگے۔

"میں نے انہیں کہا تھا۔ ہماری آمد کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔"

"کیوں مگر......؟"

"ایسا نہ ہو کہ آپ ہمیں ملنے سے ہی انکار کر دیں۔"

"خیر......! اتنی بداخلاق تو میں نہیں ہوں۔ مگر سرپرائز کی اہل بھی نہیں ہوں۔"

"پھر دل کڑا کر کے رکھیے...... آج کی شام ہم نے سرپرائزز کے لئے ہی رکھی ہے۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔

چائے پینے سے پہلے عطار صاحب نے کہا۔

"بھئی......! باقی مہمانوں کو بھی بلا لیں۔"

درمان باہر نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی تسمیہ اور تابش اندر آ گئے۔

اپنی ماں کو دیکھتے ہی دونوں جذباتی ہو گئے۔

دوڑ کر آئے اور قالین پر بیٹھ کر تسبیحہ کے پاؤں پکڑ لئے۔ ایک پاؤں تسمیہ کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا پاؤں تابش کے ہاتھ میں۔

وہ دونوں زار و قطار روتے جاتے اور کہتے جاتے۔

"ماما......! ہمیں معاف کر دو......!

ماما......! ہمیں بخش دو......! ہمارا گناہ بخش دو......!

ماما......! اللہ کے واسطے......! ہمیں معاف کر دو......!"

ان کو یوں گڑگڑاتے دیکھ کر تسبیحہ بھی رونے لگ گئی۔ کبھی ایک سے پاؤں چھڑاتی...... کبھی دوسرے سے...... کبھی ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی۔

ایسا رقت آمیز منظر تھا کہ سب ہی آبدیدہ ہو گئے۔

"اب اُٹھو......! میرے پاس اوپر بیٹھو......!"

وہ روتے روتے ان سے کہہ رہی تھی۔

"نہیں......! پہلے آپ سب کے سامنے اعتراف کریں کہ آپ نے ہمیں معاف کر دیا ہے۔"

"چپ کر جاؤ......! چپ کر جاؤ......! ورنہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔"

وہ چپ ہو گئے۔

"میں نے آپ کو دل سے معاف کر دیا تھا۔ بلکہ اب تو میں خود آپ کی شکر گزار ہوں۔

آپ نے مجھے ایسا رستہ دکھا دیا کہ میری عاقبت سنور گئی۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔

''بچو.....! اللہ کی قسم.....! میں بہت خوش ہوں۔ مسجد نبویؐ کی ملازمت نے میرے جنم جنم کے گناہ دھو دیئے ہیں۔''

''ماما.....!''

تسمیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو اس بات کا ثبوت دینا پڑے گا کہ ہماری طرف سے آپ کا دل صاف ہوگیا ہے۔''

''ہاں ماما.....!''

تابش نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اُٹھو.....! پہلے باری باری میرے سینے سے لگ جاؤ.....! تمہیں خود ثبوت مل جائے گا۔''

وہ دونوں اُٹھ کے باری باری اس کے سینے سے لگے۔ اس نے تابش کا ماتھا چوما اور تسمیہ کو دونوں رُخساروں پر پیار کیا۔

''مجھے تم تینوں پر فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

بچوں کو کہاں چھوڑ کے آئے ہو.....؟''

''وہ کب پیچھے رہنے والے تھے.....؟'' تسمیہ نے زور سے پکارا تو تابش کی بیوی اور تسمیہ کا شوہر اپنے دو دو بچوں کی اُنگلی پکڑے اندر آگئے۔

''آؤ میرے بچو.....!''

تسمیہ پھر رونے لگی۔

''مجھ پر کہیں شادیٔ مرگ طاری نہ ہو جائے۔''

باری باری اس نے جولیانہ اور منان کو پیار کیا۔ بچوں کو سینے سے لگایا اور عطار صاحب کی طرف دیکھ کر بولی۔

''میرا خیال ہے آج کے لئے اتنے سرپرائز کافی ہیں۔''

''نہیں.....!

ابھی اور ہیں.....!''

عطار صاحب بولے۔

''اور ہیں.....؟''

وہ چیخ کر بولی۔

''ایک سرپرائز میری طرف سے ہے۔''

شیخ عبدالعزیز نے کہا۔

''وہ کیا.....؟''

تسمیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ تو آپ نے سب کو بتا دیا ہے کہ میں آپ کا بڑا بھائی ہوں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔''

تسمیہ بولی۔

''تو مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق دیجئے۔''

اس کے حیران چہرے کو دیکھ کر انہوں نے بات جاری رکھی۔

''دستور کے مطابق شیخ عطار نے آپ کا ہاتھ مجھ سے مانگا ہے اور میں.....''

"یا اخی.....؟"

وہ چیخی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟"

"یہ تو کہہ رہا ہوں کہ یا تو بڑا بھائی ہونے کا حق دیں..... یا یہ حق مسترد کر دیں۔"

"یا اخی.....! یہ میری کوئی عمر ہے.....؟"

"چھوڑو اختی.....! عمر کا قصہ..... یہاں عرب معاشرے میں ساٹھ سال کی عورت کی بھی شادی ہو جاتی ہے..... اور ستر سال کی عمر کی عورت کی بھی..... شرع نے کوئی قدغن نہیں لگائی۔ اگر کوئی خواہش مند ہو تو۔

شیخ عطار نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے ہاں کہہ دی۔"

"یا اخی..... یا اخی.....! اگر میں انکار کر دوں تو.....؟"

"ماما.....!"

تسمیہ بولی۔

"اگر آپ نے انکار کیا تو ہم سمجھیں گے کہ آپ نے ہم دونوں کو معاف نہیں کیا۔"

"ہاں ماما.....!"

تابش بولا۔

"پچھلے کئی مہینوں سے ہم عطار صاحب کے ساتھ ہیں۔ ان کی شخصیت نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے۔

ہم ان کو پاپا بلانے میں فخر محسوس کریں گے۔ پہلے ہم ان سے ملے

نہیں تھے۔ سب باتیں نادانی میں ہوگئیں۔ ہم ان کے لئے بہت شرمندہ ہیں۔"

"ماما.....!"

تسمیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور کہا۔

"ماما.....! آپ کو میرے سر کی قسم.....! اگر انکار کریں تو....."

تابش نے بھی اس کی تقلید میں دوسرا ہاتھ پکڑ کے فوراً اپنے سر پر رکھ لیا اور بولا۔

"ماما.....! آپ کو میرے بھی سر کی قسم.....! اگر آپ انکار کریں تو....."

درمان کہاں پیچھے رہنے والا تھا.....؟ تسمیہ والا ہاتھ کھینچ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور بولا۔

"آپ کو میرے بھی سر کی قسم.....! اگر اب آپ انکار کریں تو میرا مرا منہ دیکھیں۔"

تسمیہ بے بس ہو کر رونے لگی۔

"یہ آپ مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں.....؟"

"ماما.....! ہم آپ کو آپ کا حق واپس لوٹا رہے ہیں۔"

"جبکہ میں خود اس حق سے دستبردار ہو رہی ہوں۔"

"نہیں ماما.....!"

تابش نے پھر قالین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لئے اور بولا۔

"ماما.....! اگر آپ حامی نہیں بھریں گی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ نے

ہمیں دل سے معاف نہیں کیا۔"

"ہاں ماما......!"

تسمیہ بولی۔

"اور یہ بھی سمجھیں گے کہ آپ نے ہماری طرف سے دل صاف نہیں کیا۔"

تسمیہ نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔ اپنے داماد اور بہو کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرا کر تائید کرنے لگے۔

تب اس نے عطار صاحب کی طرف رُخ کیا اور بولی۔

"عطار صاحب......! میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں وہ پہلے والی مشنری عورت نہیں ہوں اور میں کوئی اور کام کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ بقیہ زندگی یہیں رہوں گی اور یہی کام کروں گی۔"

"کوئی بات نہیں......! میں بھی یہیں رہوں گا۔ میں بھی یہی کام کروں گا۔"

وہ بولے۔

"اور وہ آپ کی یونیورسٹی......؟ وہ اعلیٰ مقاصد......؟ وہ مسلم اُمہ کی نشاۃِ ثانیہ......؟ کیا وہ سب باتیں تھیں......؟"

"نہیں......! وہ کام اسی طرح جاری رہے گا۔ انشاء اللہ......!

آپ کو یہ بھی بتانا تھا کہ پچھلے دنوں میں نے نئے لوگ تیار کئے ہیں۔

جولیانہ کو میں نے ایڈاپٹ کر لیا ہے۔ اس کا مسلم نام جویریہ ہے اور

منان کو بھی اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اس رشتے سے اب تسمیہ میری بہو ہے اور تابش میرا داماد ہے۔

میں نے یونیورسٹی کے سارے کام ان کو سمجھا دیئے ہیں۔ انہوں نے اپنا اپنا شعبہ منتخب بھی کر لیا ہے۔

یہ امریکہ چلے جائیں گے۔ سارا کام میری سپرویژن میں ہوگا اور میں تو آپ کو معلوم ہے، پہلے بھی نگر نگر گھوم گھوم کر کام کرتا تھا۔ اب بھی گھوم پھر کے یہاں آجایا کروں گا۔"

سب نے تالیاں بجائیں۔

"عطار صاحب......! کتنی خوب صورتی سے آپ نے میرے سارے رشتے چرا لئے ہیں۔ سارے ووٹ اپنی طرف کر لئے ہیں۔ یہی سب سے بڑا سرپرائز ہے۔"

"نہیں......! ایک اس سے بھی بڑا سرپرائز اور ہے۔"

"اور بھی......؟"

تسمیہ روہانسی ہوگئی۔

"ابھی میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ درمان کے ساتھ طے کرنا ہے۔"

"نہیں میں......؟"

درمان چیخا۔

"مگر آپ کی بیٹی تو گیارہ سال کی عمر میں......"

"ہاں......!"

عطار صاحب بولے۔

"یہ میری سگی بیٹی نہ سہی مگر میں نے اسے سگی بیٹیوں کی طرح پالا ہے۔

تسبیح......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا...... گاؤں میں میری ایک منگیتر تھی۔"

تسبیحہ نے سر ہلایا۔

"جب میں نے امریکہ میں شادی کر لی تو ماں نے اس پر شادی کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وہ تو بالکل نہیں مانتی تھی۔ جب ماں بیمار رہنے لگی تو اس نے ماں سے کہا۔ اپنی تسلی کے لئے اس کی شادی غفار سے کر دیں۔

غفار میرا چھوٹا بھائی تھا۔ مگر وہ دائم المریض تھا۔ بالآخر ماں نے اس کی شادی غفار سے کر دی۔ بچی کی پیدائش سے پہلے غفار فوت ہوگیا۔ پھر بچی کی پیدائش کے دوران خیرالنساء بھی چل بسی۔

ماں کی خواہش پر میں نے اس بچی کی ساری ذمہ داری خود اٹھا لی۔

جب تک ماں جی زندہ رہیں۔ اس کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ میں جب پاکستان آتا تھا، اسے ملنے ضرور جاتا تھا۔

اس کی خواہش پر میں نے اسے میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا تھا۔

اب وہ ڈاکٹر بن گئی ہے اور میری خواہش ہے کہ درمان بیٹا اس سے شادی کر لے۔"

"نہیں ماں......!"

درمان بپھر کر بولا۔

"میں اپنی پسند سے شادی کروں گا۔"

"نہیں برخوردار......! یہ شادی تو تمہیں میری پسند سے کرنی پڑے گی۔"

وہ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

"میں اپنی بیٹی کو لے کر آتا ہوں۔"

اور ساتھ ہی ایک دُبلی پتلی، خوب صورت سی، شرمیلی سی لڑکی کو لے کر اندر آ گئے۔

"یہ ہے میری بیٹی خیریہ......!"

"خیریہ......!"

غصے سے بھرا بیٹھا درمان چیخ کر کھڑا ہوگیا۔

"تم اسے جانتے ہو درمان......؟"

تسبیحہ نے پوچھا۔

"ماما......! یہ...... یہ میری کلاس فیلو ہے...... اور......"

"اور تم دونوں شادی کرنا چاہتے ہو......؟ ہے نا......؟"

"مگر اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا...... یہ آپ کی بیٹی ہے......!"

"اور دانی......! تم کتنے گھنے ہو...... تم نے بھی تو اس کے بارے میں مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا......؟"

"ماما......!"

وہ شرمندگی سے بولا۔

"امتحان پاس کرنے کے بعد ہی بتانا تھا...... پھر وہ بیچ میں دوسرا

جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ میں چپ ہوگیا کہ آپ کہیں گی...... میں بھی اپنا قصہ لے بیٹھا ہوں۔''

''کالج میں چونکہ درمان کا نام توکل حسین ہی بولا جاتا ہے۔ اس لئے میں بھی پہچان نہیں پایا۔ مگر جب ملازمت کے لئے اس کے کاغذات میرے پاس پہنچے تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ خیریہ جس توکل کا ذکر کرتی رہتی ہے، وہ یہی ہے۔''

''کیوں خیریہ......؟''

خیریہ نے شرما کر گردن جھکا لی۔

''ادھر آؤ بیٹی......! میرے پاس آؤ......!''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی۔ تسمیہ نے اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا اور اپنے گلے سے اللہ والا لاکٹ اُتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور بولی۔

''مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔''

''اختی......! مجھے بھی یہ رشتہ منظور ہے۔''

''اب ایک ضروری اعلان سنیں......! کل 15 شعبان ہے۔ یہ دونوں نکاح مسجد میں ہوں گے اور اس کے بعد سارا خاندان عمرہ کرے گا۔''

''ٹھیک ہے......! ٹھیک ہے......!''

سب نے شور مچایا۔

''اور کل رات کی ضیافت میری طرف سے جدہ کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ہوگی۔''

دوسرے دن یہ سارا خاندان جب حرم شریف کے دروازے پر پہنچا تو ترکیہ کا ایک وفد عمرہ کرنے کے لئے اندر جا رہا تھا۔

اور ''لبیك اللھم لبیك'' کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔

''لبیك اللھم لبیك'' کے ساتھ اپنی آوازیں ملاتے ہوئے یہ سب لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔

اختتام

❁ ❁ ❁